کتاب و سنت اور اسلافِ اُمّت کی تعلیمات کا علمبردار

ماہنامہ

اشرف الجرائد

حیدرآباد

Volume:8 Issue:11 November 2015

مُدیر

مولانا محمد عبدالقوی

ادارہ اشرف العلوم ٹرسٹ حیدرآباد

www.idara.info

اشرف الجرائد میں شامل تمام مضامین کی تمام جزئیات سے مدیر کا اتفاق ضروری نہیں

آئینۂ مضامین

پیش گفتار	گذشتہ ادارئے پر استدراک اور وضاحت	مدیر	۵
درسِ قرآن	پردے اُٹھے ہوئے ہیں ان کی اِدھر نظر بھی ہے	مولانا عبدالقادر فرید قاسمی	۲۶
درسِ حدیث	علاماتِ نفاق	مولانا سید نذیر احمد یونس قاسمی	۲۸
گوشۂ خواتین	تسبیحاتِ فاطمہؓ کا اہتمام کیجئے۔	مفتی محمد احمد علی قاسمی	۳۱
اصلاحِ معاشرہ	ماہِ صفر میں رائج توہمات ورسومات	مولانا عبدالرشید طلحہ نعمانی قاسمی	۳۴
تعاقبِ فرق ضالہ	فتنۂ انکارِ حدیث اور اسباب وعلل	مولانا محمد کبیر الدین قاسمی	۳۹
اسلامی آداب	مسواک کے فضائل وآداب	مفتی شیخ آصف علی قاسمی	۴۵
فقہ وفتاویٰ	سود کی رقم سے رشوت اور ٹیکس دینے کے بعض مسائل	ادارہ	۴۷
خبرنامہ	عالمِ اسلام کی خبریں	مولانا عبدالقادر فرید قاسمی	۵۰

اشرف الجرائد کی توسیع واشاعت میں حصہ لے کر اشاعتِ دین کا ثواب حاصل فرمائیں۔ادارہ

پیش گفتار

گذشتہ اداریے پر استدراک اور وضاحت

مدیر

گذشتہ ۲۱ برسوں سے ادارے سے نکلنے والے ترجمان کے لئے چند سطریں لکھنے کی اس عاجز کو توفیق ہوتی رہی، عموماً اپنے بڑوں سے سیکھی سنی ہوئی یا تجربات سے حاصل ہوئی باتیں رقم کر دیا کرتا ہوں، موقع محل اور ضرورت کے کتنی مطابق ہوتی ہیں، اسی طرح علم صحیح سے کس قدر جوڑ کھاتی ہیں وہ ناظرین باتمکین ہی جانتے ہیں، مجھے اپنے بعض بزرگ علماء کی طرف سے اطمینان کے دو جملے سننے کو نہ ملتے تو میں خود بھی اپنی سطحِ علم کی روشنی میں کبھی مطمئن نہ ہوتا اور نہ اس سلسلے کو جاری رکھ پاتا۔

خطا ونسیان سے پاک کسی کا نظریہ وخیال نہیں ہوسکتا، یہ عاجز بہت ہی ڈرتے ڈرتے اپنے مضامین مرتب کے حوالے کرتا ہے، ہمیشہ ڈر لگا رہتا ہے کہ علماء کرام کی نظر میں کہیں نامقبول وغیر معتبر نہ ہو جائیں، اس لئے کہ علم علماء کرام کی قبولیت ہی سے معتبر ہوسکتا ہے؛ علماء کرام کسی غلطی کی طرف توجہ دلائیں تو اسے قبول کر لینا گمراہی سے حفاظت کا واحد راستہ ہے؛ بحث ومباحثہ علماء کے درمیان تو بے شک مناسب ہے، مجھ ایسے لکھنے والوں کی طرف ''العلم'' کی نسبت بھی قحطُ الرجال کی مجبوری ہے؛ اس عاجز کا معمول یہی ہے کہ اہل حق سے مناقشے کے بجائے خموشی اختیار کر لی جائے مگر اہلِ باطل کے حق میں خموشی کے بجائے زبان وقلم کا تا بہ مقدور استعمال کیا جائے۔

لکھنے پڑھنے کی اس مشق میں چند ہی مواقع ایسے آئے کہ اپنوں سے الجھنا پڑا، اور وہ بھی سخت ناگواری وضیقِ قلبی کے ساتھ! اس وقت بھی ایسی ایک صورتحال کا سامنا ہے؛ گذشتہ ماہ کے شمارے میں ایک عزیز اور محبت وعقیدت رکھنے والے نوجوان عالم دین کے ایک خط کا جواب دیتے ہوئے خدام دین کی جز معاشی کے مسئلے پر میں نے چند سطریں تحریر کی تھیں، اور ایسی عجلت میں کہ وہ مضمون ایک ہی وقت میں لکھا جاتا اور ٹائپ کیا جاتا رہا،۔۔۔۔ اور اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ اپنے اسفار کی کثرت اور مشاغل کے تنوع کی وجہ سے پرچہ پریس میں جانے کا وقت آجانے کی وارننگ سُن کر ہی اداریے کے لئے قلم اُٹھاتا ہوں۔۔۔۔ بہرحال جو کچھ ذہن میں آیا

نوجوان علماء وفضلاء کی ہمت افزائی اور جوشِ عمل کی بیداری کے خیال سے لکھتا چلا گیا۔

اس کے بعد علاقے کے کئی اسفار ہوئے، کئی خدامِ دین نے بلکہ ایک عالم کے تو والد صاحب نے بھی اس مضمون سے نفع ہونے اور حوصلہ وہمت کے بڑھنے کا ذکر کیا، میرا مقصود بھی اسی قدر تھا؛ تاہم ایک مفتی صاحب[1] نے اس مضمون پر تنقید نامہ بہ عنوان ''علماء کی یافت پر سنجیدہ غور وفکر کی دعوت'' لکھ کر ای میل کیا، جس میں میرے محررہ تمام تر خیالات کو میزانِ تحقیق میں غیر معتبر، الفاظ وتعبیرات کی ہیرا پھیری، جواب کا سوال سے غیر متعلق وغیر منطبق ہونا، اس جواب کا مسئلہ کا حقیقی حل نہ ہونا، سائل کے سرائر وضمائر کو جانے بغیر بے سروپا باتیں کہہ دینا قرار دے کر مجھے اپنے مضمون سے رجوع کر لینے یا پھر ان کے ہر اعتراض کا جواب دینے کا مکلف بنایا، بہ صورتِ دیگر اس مضمون کو اشرف الجرائد میں شامل کرنے کی خواہش ظاہر کی تاکہ جہاں تک میرا غیر محققانہ و غیر عادلانہ جواب پہونچا ہے وہاں تک مفتی صاحب موصوف کی تحقیق وتنقید بھی پہونچ سکے، اور قارئین اشرف الجرائد کے غلط تأثرات کو صحیح رُخ پر ڈالا جا سکے۔

مفتی صاحب موصوف کے اس تنقید نامے کو پڑھ کر مجھے لگا کہ وہ جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ خدامِ دین کی قلتِ یافت وتنگیٔ معاش کا حل صبر وایثار کی نصیحتیں کرنا اور اجر وثواب کے تمغے دینا نہیں ہے بلکہ ذمہ داروں کا عیش کوشی اور خود پروری چھوڑ کر خدامِ دین کی تنگی کو دور کرنے کی فکریں کرنا ہے؛ مگر وہ اس بات کو جذبات واحساسات سے مغلوب ہو کر کسی صحیح عنوان وعبارت میں تحریر وتعبیر نہ کر سکے، اگرچہ بالقصد ایسا نہیں ہوا ہوگا؛ اور اگر بات یہی ہے تو کچھ غلط بھی نہیں کیوں کہ وہ بھی ایک اس مسئلے کا ایک اہم پہلو ہے، نہ صرف لکھنے کا بلکہ عملاً غور وفکر کرنے کا بھی؛ میں نے موصوف ہی سے یہ کہتے ہوئے درخواست کی کہ اگر اس مضمون کی تنقیدیں محض اس عاجز کی تنبیہ کے لئے ہیں تو میرا ملاحظہ کر لینا کافی ہے اور اگر اشاعتِ عام کے لئے ہیں تو میں کسی فاضلِ دیوبند کے حوالے سے ایسی غیر معیاری تنقید شائع کرنا مناسب نہیں سمجھتا، آں جناب اُسے ایک مثبت مضمون کی شکل میں مرتب کر دیں تو بہتر ہے، تاکہ مسئلے کا جو پہلو میرے مضمون میں رہ گیا ہے اس کی تکمیل ہو جائے، اور اگر اس مضمون کی اسی طرح اشاعت پر اصرار ہے تو اپنے تبصرے کے ساتھ شائع کروں گا؛ اس کے جواب میں مفتی صاحب موصوف نے یہ تحریر بھیجی۔۔۔۔

محترمنا ومکرمنا مدیر محترم زید فضلکم وعلمکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا، آپ نے ابتداء اتحریر فرمایا کہ: آپ نے تعارف کی زحمت نہیں

[1] جن سے یہ عاجز غالباً واقف نہیں ہے اور وہ خود بھی ظاہر ہونا نہیں چاہتے۔

فرمائی ''عرض یہ ہیکہ تعارف کی حاجت اُنظُرُوا الی ما قال، ولا تنظروا الی من قال۔ کے مسلمہ اصول کے پیش نظر محسوس نہیں کی گئی۔

شاید آپ کا یہ خیال ہو کہ وہ مضمون کسی ایک فرد کی ذہنی تخلیق کی اُپج ہو یا کسی ایک خادمِ دین کا ردِ عمل ہو، لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے، وہ مضمون تو ستم زدوں کی آہ، عرصہ سے حالات کے زخم خوردوں کی صدا، اور زبان وقلم سے اپنی مافی الضمیر کی ادائیگی پر قدرت نہ رکھنے والوں کی سسکی ہے۔ اگر چہ ایک خادمِ دین کے شکستہ قلم کے ساتھ زیرِ تحریر آ گیا ہو لیکن اس مسئلہ کا محرک اور مضمون کا محرر فرد واحد نہیں بلکہ ایک بہت بڑی جماعت ہے۔

آپ نے آگے تحریر فرمایا ہے ''یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ''طعاماً ذاغصہ[1] '' کے یہ کڑوے گھونٹ'' الخ عرض یہ ہے کہ ''الحق مرّ'' حق تو فوری گلے سے اترتا نہیں ہے، اس میں کچھ کڑواہٹ تو ہوتی ہی ہے۔

جناب مدیر محترم: وہ مضمون تنبیہ کے لئے نہیں بلکہ اظہار رائے وحقیقت کے لئے تھا اور اس بات کے لئے تھا کہ اگر آپ اس سے اتفاق رکھتے ہیں تو الحمد للہ ونور علی نور اور اگر نہیں تو پھر ہماری غلط فہمی دور کی جائے اور علمی طور پر منصفانہ ایسا جواب دیا جائے جو ہماری علمی ونظریاتی موقف سے رجوع ہونے کا اور خدام دین کی ضرورتوں کی تکمیل کا مداوا ثابت ہو۔

آپ نے آگے تحریر فرمایا ہے ''میں اپنی ناقص فہم میں کسی فاضل دیوبند کے حوالہ سے اسکی اشاعت مناسب نہیں سمجھتا'' یہ احساس تو ہمارا پہلے ہی سے ہے، جس کی واضح دلیل یہ ہے کہ ہم نے یہ مضمون صرف خواص اور اہل علم حلقے کے لئے ہی لکھا ہے، اسی لئے عربی عبارتوں کا ترجمہ نہیں کیا گیا، خالص عربی وعلمی تعبیریں واصطلاحات استعمال کی گئیں اور اشاعت عام کے لئے کسی روزنامے یا اخبار میں اس کو طبع نہیں کروایا گیا، ایک علمی مسئلہ واختلافی نظریہ کو اپنے ہی حلقہ تک محدود رکھا گیا، تاکہ اہل علم ہی علم وانصاف کی روشنی میں سنجیدہ غور وفکر کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچ جائیں اور مسئلہ کا حل نکل آئے۔

آپ نے آگے تحریر فرمایا ہے ''اگر اسی طرح اشاعت پر اصرار ہے'' الخ

عرض یہ ہے کہ ہم اصاغر، اکابر کے ساتھ اصرار کا معاملہ تو نہیں کر سکتے، لیکن چونکہ آنمحترم کا مضمون دور دور تک پہنچ چکا ہے اور ایک معمّیٰ کر عالمی علمی حلقوں میں جا چکا ہے، اس لئے ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس کا تدارک[2] اور ہمارے موقف کا اظہار بھی اسی طرح ہو اور یہ عین انصاف بھی ہے، ہاں آپ کی

---

[1] اپنے مضمون کی یہ توصیف انہوں نے خود کی تھی مدیر نے نہیں!

[2] یعنی مدیر کا وہ مضمون اس قدر بے جا تھا کہ اس کے اثرات کا تدارک ضروری سمجھا گیا!

تحریر اشاعت عام میں نہ آتی اور ایک محدود دائرے میں منحصر رہتی تو ہماری رائے بھی (ہمارے مضمون کے) اشاعت عام نہ کی ہوتی، بہر حال آپ کی بات[1] منصۂ شہود پر آچکی ہے اس لئے ہمارا موقف بھی منصۂ شہود پر آجائے، بس یہی ہماری خواہش ہے۔

مدیر محترم: آپ اگر چہ مدعیٔ نمونہ اسلاف نہیں، لیکن ہم تو آپ کو نمونۂ اسلاف جانتے ہیں اور زبان خلق تو نقارۂ خدا ہوا کرتی ہے، اور نمونۂ اسلاف ہونا تو وصفِ محمود اور باعث صد افتخار ہے۔

آپ نے اخیر میں تحریر فرمایا: ''آپ کا مضمون بے جا تنقیدوں پر تبصرہ کے ساتھ شامل اشاعت کردوں گا''

عرض یہ ہے کہ ہمارے مضمون پر آپ کا یہ تجزیہ اس بات کا غماز ہے کہ ہمارا یہ مضمون کلیۃً بے جا تنقیدوں سے پُر ہے، حالانکہ ہم نے اپنے مضمون میں بہت ساری علمی چیزوں کا اظہار کیا، آیا وہ علمی چیزیں اور کتب معتبرہ کے حوالجات بھی تنقید ہیں[2]؟ اگر کوئی تنقیدی پہلو آ بھی، گیا تو وہ تنقید بے جا نہیں، تنقید بے جا تو وہ ہوتی ہے کہ جو تنقید برائے تنقید ہوتی ہے اور ہماری تنقید تو برائے تنقیح وتعمیر ہے اور ایسی تنقید بے جا نہیں ہوا کرتی۔

تھوڑی دیر کے لئے بالفرض اس کو تنقید بے جا مان بھی لیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں اسلئے کہ ''**ان لصاحب الحق مقالاً**'' کہ حق والے کو کہنے کا اختیار ہوتا ہے، میں ایک حدیث نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں جو آپ کے تنقید بے جا والے تبصرہ کے لئے چشم کشا ہوگی اور ہمارے موقف کی مؤید بھی: **عن ابی هريرة رضی الله عنه: ان رجلا اتی النبی صلی الله عليه وسلم يتقاضاه، فاغلظ، فهم به اصحابه، فقال رسول الله صلی الله عليه وسلم، دعوه۔ فان لصاحب الحق مقالاً** (بخاری: حدیث نمبر ۲۳۰۶ مسلم، حدیث نمبر ۱۶۰۱) اور خدام دین اصحاب حق ہیں۔

پھر بھی کوئی بات جو عمومی کہی گئی ہے کسی کو خاص نشانہ بنانے کے لئے نہیں کہی گئی[3]، اگر تنقید بے جا سمجھی جارہی ہے اور مناسب سی نہیں لگ رہی ہے تو ہم کچھ مقامات حذف کرکے اور کچھ عبارتوں کو نکال کر دوبارہ ایصال کررہے ہیں، امید ہے کہ شامل اشاعت ہوجائے گا۔

مکرر معذرت کے ساتھ
والسلام
مفتی حفیظ اللہ قاسمی

---

[1] کونسی بات؟ متمول ومترفہ علماء کی شکایات یا کوئی فوری واقعی قابل عمل اور لائق توجہ تجویز؟ کیوں کہ آپ کا مضمون یہ تو بتاتا ہے کہ مدیر کا جواب غیر منصفانہ اور غیر محققانہ ہے مگر اس کا کہیں تذکرہ نہیں ہے کہ محققانہ ومنصفانہ جواب یا مسئلہ کا واقعی حل آخر کیا ہے، اس کی نشاندہی سے پہلوتہی کیوں کی گئی؟ [2] یہی بات میرے مضمون کے بارے میں کیوں نہ سوچی گئی؟ [3] جب کہ یہ سب باتیں مدیر ہی کو مخاطب کرکے لکھی گئی ہیں۔

اس تحریر کے ملنے کے بعد یہ طئے ہوگیا کہ ان کا مضمون جذبات سے مغلوبیت میں سرزد نہی ہوا بلکہ قصد وعزم کے ساتھ لکھا گیا ہے، یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ صرف اُن کے ضمیر کی آواز نہیں بلکہ ایک بڑی جماعتِ علماء کی صدائے دل ہے، نیز یہ مضمون دو ایک زیادہ کڑوی عبارتوں کو حذف کر کے مرمّم ومُہذّب کر دیا گیا ہے؛ تحریر اس ترمیم کے بعد کس معیار کی ہوگئی ہے اس پر یہ سطحی العلم اور التباس واختباط کا مریض کوئی تبصرہ نہیں کر سکتا، البتہ مضمون کے درمیان جہاں جہاں موصوف سے خود میرے مضمون کے سمجھنے میں غلطی ہوئی یا میں نے اپنی ناقص فہم سے اس پر تنقید کو بے جا سمجھا وہاں وہاں تبصرہ کر دیا ہے۔

اخیر میں اتنا اور عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ ذمہ دارانِ مدارس کو اس زمانے میں دو باتوں کی طرف خصوصی توجہ دینا بہت ضروری ہے ایک تو معلمین ومدرسین کے مشاہرات میں تابہ مقدور اضافہ کیا جانا چاہیئے، اور وقتی دشواریوں میں تعاون کرنے کے لئے ہر مدرسے میں خدام دین کے لئے کم از کم قرض اسکیم کا نظم بھی ہونا چاہیئے، ایسے نازک مواقع پر نا قابلِ واپسی تعاون کی صورتیں رکھی جائیں تو اور بہتر بات ہے؛ ایک نہیں متعدد مدارس کے ذمہ دار ہونے اور تیس سالہ تجربات رکھنے والے ناظم کی حیثیت سے میں اس سلسلے کی مشکلات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں، پھر بھی بعض مصارف کو گھٹا کر اس مصرف کو بڑھانے کے راستوں پر غور کیا جا سکتا ہے، یہ عاجز خود بھی اپنی بساط بھر سعی کر رہا ہے، اگر اکابر علماء ذمہ دارانِ مدارس کو جوڑ کر تمام پہلوؤں سے اس مسئلے پر مباحث کی راہ نکالیں تو ان شاء اللہ کوئی بہتر نتیجہ سامنے آسکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ مدارس میں بالخصوص آخری سالوں میں طلبہ کرام کی اپنے اکابر واسلاف کی عزیمت وہمت، صبر وثبات، غیرت وخودداری، استغنا واستعفاف سے بھرپور تاریخ کی روشنی میں فکری وذہنی تربیت کا اہتمام بھی ہونا چاہیئے، اس کا بہت نفع ہوتا ہے، یہ عاجز اس بیساکھی کے سہارے تقریباً دو سو خدام دین کا قافلہ لے کر چل رہا ہے، آج چھوٹے مدارس تو کیا مرکزی مدارس میں بھی اس سلسلے کے فقدان یا کمی کی جو صورتحال ہے وہ افسوس ناک ہے، یہ صورتحال مستقبل میں دین کے میدانوں کو جاں باز اور مستغنی عن الخلق خدام سے محروم کر دے گی، اکابر کی زندگیوں سے سبق پذیری تو دور کی بات ہے ان کے احوال سے باخبری عوام کی طرح علماء میں بھی ختم ہوتی جارہی ہے، روحانیت پر مادیت کا، صبر وشکر پر شکوہ وشکایات کا، صدق توکل پر عجلت وجلد بازی کا اور تسلیم ورضا پر تقابل وتحاسد کا غلبہ تیزی سے پھیلتا جارہا ہے، بات چھوٹی اور کڑوی ہے مگر بہت اہم!

آگے مفتی صاحب موصوف کا تنقید نامہ مع تبصرہ ہدیۂ قارئین ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

علماء کی یافت پر سنجیدہ غور وفکر کی دعوت

(ایک اداریہ کی روشنی میں درمندانہ تحریر)

مفتی حفیظ اللہ قاسمی

ماہنامہ اشرف الجرائد کے ماہِ اکتوبر کا اداریہ نظروں سے گذرا جو ایک سوال اور جواب پر مشتمل ہے، مدیر محترم نے سوال کا جواب دینے میں کافی زور قلم آزمایا ہے[۱] اور دلائل سے مرصع کرنے کی بھی بھرپور کوشش فرمائی ہے اور اپنے علم وخیال کے حد تک اس جواب کو الجواب الکافی[۲] سمجھ لیا ہے۔

لیکن ہم کو اپنی تمام تر علمی بے مائیگی اور بے سروسامانی کے باوجود اس جواب سے اتفاق واطمینان نہیں ہے،[۳] مدیر محترم کا مقام اور ان کی خدمات ان کے جذبات اور ان کا احترام سب ہم کو تسلیم[۴] لیکن اس مسئلہ میں جو غلط فہمی ہوئی ہے اس کا ازالہ اور علمی تدارک بھی ضروری ہے، اس لیے کہ یہ ایک علمی ودینی مسئلہ ہے۔

مدیر محترم نے اپنی ایک رائے پیش کی اور علمیت کا اظہار فرمایا[۵] اور ہماری رائے اس سلسلہ میں اس سے کچھ، بلکہ بہت کچھ مختلف ہے۔

لہٰذا علمی مسئلہ ہونے کے ناطے اختلاف ہوجانا اور رائے کا مخالف ہوجانا اور علمی میدان میں مخالف رائے کا اظہار کرنا نہ کوئی سلف میں معیوب وملوم رہا ہے اور نہ خلف میں شنیع وقبیح[۶]، بلکہ اختلاف سے ہر دو پہلو سامنے آکر مسئلہ میں نکھار پیدا ہوجاتا ہے اور علمی زبان میں اس کو یوں بھی تعبیر کرسکتے ہیں،

---

۱ فجر سے قبل سفر درپیش تھا، عشاء کے بعد ایک ساتھ لکھا جاتا اور ٹائپ ہوتا رہا؛ عشائیہ کے بعد سرسری نظر ثانی کرلی گئی، سوچا جاسکتا ہے کہ اس میں زورِ قلم آزمانے کا موقع کتنا ملا ہوگا اور دلائل سے مرصع کرنے کی کتنی نوبت آئی ہوگی؟

۲ سمجھ لینے کا علم دوسرے کو یا تو دعوے سے ہوسکتا ہے یا قرینے سے یا پھر کسی کشفی ذریعے سے، پہلے دو تو یہیں نہیں تیسرے کا تنقید میں کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔

۳ کوئی ضروری بھی نہیں ہے کہ سب کو اتفاق ہوجائے، نہ ہی مدیر کو اس پر اصرار تھا۔

۴ غلط بات ہے؛ اس لئے کہ تنقید میں اس کا ذرا بھی لحاظ نہیں رکھا گیا، اگلا پیراگراف ہی دیکھ لیجئے۔

۵ قطعاً میں نے علمیت جھاڑنے کی کوشش نہیں کی، خدام دین کا حوصلہ بڑھانے کا ارادہ ضرور کیا تھا۔

۶ مجھے بھی اس سے اتفاق ہے تاہم میری کم ہمتی تنقید میں بھی تہذیب کو بہتر سمجھتی ہے۔

تنقید سے مسئلہ کی تنقیح ہوتی ہے اور اختلاف فی الأنظار سے اقتراب الی الحق ہوتا ہے[۷]، یہاں ابن قتیبہ دینوریؒ کی تصریح اس مسئلہ میں سامنے رکھی جائے تو نہ صرف یہ کہ یہ ایک ذمہ داری اور حق ہے بلکہ یہ عمل (تنبیہ وغلط فہمی کے ازالہ والاعمل) قابل اجر عنداللہ اور قابل تشکر عندالناس ہوگا،[۸] ابن قتیبہؒ اپنی مایہ ناز علمی تصنیف میں تحریر فرماتے ہیں: و قدیظن من لا یعلم من الناس و لا یضع الأمور مواضعھا[۹]، أن ھذا اغتیاب للعلماء و طعن علی السلف ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ و لیس ذالک کما ظنوا، لأن الغیبۃ سب الناس بلئیم الأخلاق و ذکرھم بالفواحش و الشائنات و ھذا ھو الامر العظیم المشبہ بأکل اللحوم المیتۃ فأما ھفوۃ فی حرف أو زلۃ فی معنی أو اغفال أو وھم و نسیان فمعاذاللہ أن یکون ھذا من ذالک الباب أو أن یکون لہ مشاکلاً أو مقاربا أو یکون المتبہ علیہ أثما بل یکون ماجوراً عنداللہ، مشکوراً عند عبادہ الصالحین الذین لا یمیل بھم ھوی و لا تدخلھم عصبیۃ و لا یجمعھم علی الباطل تحزب و لا یلفتھم عن استنابۃ الحق حسد۔ (اصلاح غلط أبی عبید ص: ۶۴ مطبوعۃ دار الغرب الاسلامی بیروت)

(یہ تحریر چوں کہ اہل علم کے لیے لکھی گئی ہے اس لیے اس طویل عربی اقتباس کے ترجمہ کی ضرورت نہیں رہی)[۱۰]

ابن قتیبہؒ کی اس کتاب کو دیکھنے کے دوران ایک اور مقام مطالعہ سے گذرا جس نے اس تحریر پر غلط فہمی کے ازالہ پر اور قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا اور اس سلسلہ میں جو قلبی خلش اور قلمی تردد تھا اس کا مکمل

---

۷ بشرطیکہ نفس مسئلہ میں اختلاف ہو یہاں مسئلے کے دو مختلف پہلو سامنے ہیں، اس کی تفصیل آگے عرض ہے۔

۸ یقیناً دونوں اجور عاجل و آخر قابل تحصیل ہیں، کرنا ہی چاہیے، لیکن اس صراحت کی ضرورت اس وقت ہوتی جب کہ مدیر حق تنقید کو تسلیم نہ کرتا۔

۹ غلطی ناقد سے بھی یہی ہوئی ہے، کیوں کہ مدیر خدام دین سے مخاطب تھا اور ناقد آمرین و ناظمین سے مخاطب ہیں؛ اگر ایک ہی موضوع مان لیا جائے تب بھی مدیر نے ایک پہلو سے گفتگو کی ہے اور ناقد نے مسئلے کے دوسرے پہلو پر کلام کیا ہے، سوچئے کہ نظماء و امراء ـــــ بقول ناقد ـــــ خدام دین پر ظلم و جور کے مرتکب ہیں اور ان کی تنگ معاشی کے واحد ذمہ دار ہیں اور مظلوم خدام دین ان کی درستگی پر قادر نہیں ہیں تو ان کے سامنے دو ہی راستے ہو سکتے ہیں، اگر تحمل نہ ہو تو کوئی جائز ذریعہ معاش اختیار کر لیں اور اگر تحمل کا حوصلہ ہو تو ثواب آخرت کی امید میں کار دین میں لگے رہیں، اور اللہ سے اچھی امید رکھیں؛ میں نے بے بس خدام کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی ہے اور ناقد نے بے حس نظماء و امراء کی حس جگانے کی فکر کی ہے، یہ بھی اہم موضوع ہے اور قابل ذکر و لائق فکر ہے مگر یہ دوسرا پہلو پہلے پہلو کو لغو و بے معنیٰ کیسے کر سکتا ہے؟ صحیح طریق کار یہ تھا کہ میرے مضمون کی واقعیت و ضرورت کو تسلیم کرتے ہوئے اس پہلو کی جانب بھی توجہ دینی کی ضرورت پر قلم اٹھایا جاتا۔

۱۰ یہ اور اس کے بعد کی تفصیل تحصیل حاصل ہے کیوں کہ جب اہل علم کے لئے آپ نے نقل کی ہے تو کون اہل علم تنبیہ علی الخطا یا کو غلط سمجھتا ہے؟ بلکہ اس کا متمنی رہتا ہے ہاں! تنقید تنقیص و تحقیر سے پاک ہونی چاہئے۔

صفایا کر دیا، اور اب ہم پورے انشراح کے ساتھ اس تحریر پر آمادہ ہو گئے۔

ابن قتیبہؒ فرماتے ہیں کہ لوگوں میں مشہور ہے کہ عالم کی زلت و پھلسن سے بچو لیکن کیسے بچیں گے جب تک کہ زلت وخطا کا پتہ نہ چلے، لہٰذا بچنے کے لیے پہلے اس زلت کا علم ہونا چاہئے اور علم اس وقت ہوگا جب کہ اس کو واضح کیا جائے اور اس پر دلائل و براہین قائم کئے جائیں اور اگر اظہار نہ کیا گیا تو اس عالم کے ماننے والے پیروکار اس زلت ہی کو قبول کر لیں گے اور خطا کو صواب سمجھ بیٹھیں گے، ابن قتیبہؒ کے الفاظ درج ذیل ہیں:

وقد قيل لنا: اتقوا زلة العالم، وزلة العالم لا تعرف حتى تكشف وان لم تعرف هلك بها المقلدون، لأنهم يتلقونها من العالم بالقبول ،ولا يرجعون الا بالاظهار لها واقامة الدلائل عليها واحضار البراهين (اصلاح غلط أبی عبید ص: ۴۶)

اصل بات شروع کرنے سے پہلے ہم اس بات کی وضاحت وصراحت کر دینا ضروری سمجھیں گے کہ یہ مضمون کسی کی دل آزاری، کسی پر شخصی حملہ، کسی کی ہتک عزت یا مقابلہ آرائی اور اظہار علمیت کے لیے نہیں، بلکہ صرف اظہار رائے، غلط فہمی کے ازالہ اور جواب کے عدم انطباق کی وضاحت کے لیے لکھا گیا ہے۔[۱۱]

ہمیں جن باتوں سے اتفاق نہیں جو مقامات قابل گرفت اور قابل تأمل نظر آئے ہیں ہم ان کو نمبر وار اگلی سطور میں پیش کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں ہفوات و ہذیانات سے محفوظ فرمائے[۱۲] اور ہمارے قلم کو راستی پر لگائے۔ (آمین)

نوٹ کے طور پر شروع میں یہ بات ذہن نشین رکھیں کہ مدیر محترم کے جوابات سوال پر منطبق ہی نہیں ہیں، سوال ایران کا ہے تو جواب توران کا ہے، سوال حوائج سے متعلق ہے اور جواب زوائد سے متعلق دیا گیا ہے، سوال ضروریات سے متعلق ہے اور جواب ضروریات کو بھی اسراف وتعیّشات سمجھ کر دیا گیا ہے۔[۱۳]

---

[۱۱] اس تبراء کے باوجود دل آزاری اور ہتکِ عزت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی، جہاں تک اظہارِ رائے کی بات ہے تو وہ مثبت انداز میں بھی ہو سکتی تھی بلکہ زیادہ نافع ہو سکتی تھی، رہ گیا جواب کے عدم انطباق پر متوجہ کرنا سو وہ بھی اس لئے صحیح نہیں ہے کہ میرے مخاطب طبقے کے لئے یہی دو راستے تھے کہ حوصلہ ہو تو صبر وثبات کے ساتھ کام میں لگے رہیں اور اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ کے مطابق کشائش کا انتظار اور یقین رکھیں، اور اگر حوصلہ نہ ہو تو کسی بھی جائز ذریعہ کو اختیار کر کے بقدر گنجائش دین کی خدمت کر لیں تو اس میں بھی کوئی بُرائی نہیں، اس جواب پر نا قدیہ تو کہہ سکتا ہے کہ یہ جواب نامکمل ہے، جس طرح ماتحتین کو نصیحت کی گئی ہے ذمہ داروں کو بھی متوجہ کرنا چاہئے تھا، اگر ایسا کہا جاتا تو یہ قابل قبول اور معقول تنقید ہوتی لیکن سرے سے مدیر کی خیر خواہی وحوصلہ افزائی کو غلط جواب قرار دے کر طنز وطعن کرنا اور رجوع کی تلقین کرنا سمجھ سے باہر ہے۔

[۱۲] اللہ پاک معاف فرمائے آپ پوری طرح محفوظ نہیں رہ پائے۔ (۱۳ اگلے صفحے پر)

(۱) مدیر محترم نے جواب دیتے ہوئے فرمایا ہے: رزق کی ذمہ داری اللہ پاک نے خود نے لے رکھی ہے، بندوں کے ذمہ نہیں کی ہے، اسکے بعد وما من دابة فی الأرض الا علی الله رزقها اور اس جیسی اور آیات پیش فرمائی ہیں، حالاں کہ یہ بدیہی امر ہے کہ ہمارے مسئلہ سے یا سوال کے جواب سے اس آیت کا تعلق نہیں ہے کیوں کہ سوال رزق مطلوب سے متعلق ہے اور جواب میں جو آیت پیش کی گئی ہے وہ رزق مکتوب سے متعلق ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے جس کے نہ سمجھنے کی وجہ سے بڑا التباس واختباط رہتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ایک ہوتا ہے رزق مکتوب جو اللہ تعالیٰ نے ازل میں لکھ دیا ہے جس کا بیان اس آیت میں کیا گیا ہے، لیکن ہم کو علم نہیں کہ ہمارا رزقِ مکتوب کیا ہے، ہم کو رزقِ مطلوب یعنی کسب ومعاش، حرفت وتجارت ونیز دیگر اسباب کے اختیار کرنے کا حکم ہے، صرف رزقِ مکتوب پر اعتماد کر کے کسب واسباب کے چھوڑنے کا حکم نہیں ہے، خود قرآن نے بے شمار مقامات پر کسب واسباب کے اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، فاذا قضیت الصلوة فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل الله (سورة الجمعة) اور فرمایا: هو الذی جعل لکم الأرض ذلولا فامشوا فی مناکبها وکلوا من رزقه (الملک)

صرف یہ دھوکہ کھا لینا کہ اللہ تعالیٰ نے رزق لکھ دیا ہے لہٰذا طلب وجستجو اور اجتہاد واکتساب کی ضرورت نہیں، یہ خیال اور اس کی طرف دعوت پورے نظام معاش، نظم عالم اور انتظام اسباب کو معطل کر کر رکھ دے گا اور اسباب ومسببات کی یہ ساری دنیا بے کار ہو کر رہ جائیگی۔[۱۴]

یہ جان لینا چاہئے کہ ظہور قضا ان اسباب ہی کی شکلوں میں ہوگا، رزق مکتوب طلب واکتساب کی شکلوں میں سے کسی شکل میں ہی ظاہر ہوگا، صاحب تفسیر المنار نے اس آیت (وما من دابة الخ) کے تحت لکھا ہے: وقد علم بنصوص القرآن وبسنن الله فی الخلق وأسباب الرزق أن مشیئته تعالیٰ لاتکون الا بمقتضی سننه فی ارتباط الأسباب بالمسببات وحکمته فیها، والجهل بهذا مما أفسد علی المسلمین دنیاهم ودینهم، وأضاع جُل ملکهم وجعل جماهیرهم عالة علی غیرهم (تفسیر المنار: ج ۱۲، ص ۱۴)

---

[۱۳] یہ ناقد جیسے دقیق النظر کی رائے اور خیال ہے باقی مدیر جیسے سطحی الفہم، بہت سے قارئین نے جواب سے تسلی واطمینان اور عزائم کو جلا ملنے کا اظہار کیا ہے۔

[۱۴] مدیر نے کسب کی مخالفت کی تھی یا قناعت کی ترغیب دی تھی؟ کیا کتاب وسنت میں جہاں کسب کی فضیلت اور تعلیم دی گئی ہے وہیں پر قناعت اور اجمال فی الطلب کے فضائل بھی منقول اور خدام دین کا معمول نہیں ہیں؟ اور کتب تفسیر میں ان کی برکتوں پر مشتمل واقعات مذکور نہیں ہیں؟

خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں حکم دیا ہے کہ جو چیز تمہارے لیے نافع ہو اس کے حصول میں حرص سے کام لو، فرمایا: احرص علی ما ینفعک واستعن باللہ ولا تعجز بلکہ امام ابن ماجہؒ نے اس حدیث کو باب التوکل والیقین کے اندر نقل فرمایا ہے (صحیح مسلم حدیث نمبر: ۲۶۶۴، ابن ماجہ حدیث نمبر: ۴۱۶۸)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نافع چیز میں حرص کرنا اور اس کے حصول میں کوشش کرنا توکل ویقین کے خلاف نہیں ہے۔

خیر جس نے رزق مکتوب ورزق مطلوب کے فرق کو سمجھ لیا وہ مدیر محترم کے جواب کی سطحیت کو بھی سمجھ جائے گا۔

علامہ آلوسیؒ نے فامشوا فی مناکبہا وکلوا من رزقہ والی آیت کے تحت اس مسئلہ کو انتہائی منقح فرمادیا ہے: واستدل بالآیۃ علی ندب التسبب والکسب، وفی الحدیث: ان اللہ تعالی یحب العبد المؤمن المحترف وھذا لا ینافی التوکل، بل أخرج الحکیم الترمذی عن معاویۃ بن قرۃ قال: مر عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بقوم فقال: من أنتم؟ فقالوا: المتوکلون، قال: أنتم المتأکلون، انما المتوکل رجل ألقی حبہ فی بطن الأرض وتوکل علی ربہ عزوجل۔ (روح المعانی، الجزء التاسع والعشرون ص: ۲۵ مکتبہ زکریا دیوبند)

جو صرف توکل کی تسبیح پڑھتے ہیں اور ترک کسب واسباب کی تلقین وترغیب دیتے ہیں وہ اعقلھا وتوکل کے خلاف تو کر ہی رہے ہیں نیز حضرت عمرؓ کے اس ناراضگی کے مستحق اور غصہ کے مورد بھی بن رہے ہیں۔

نبی علیہ السلام نے لوگوں اور محتاجوں کو یہ حکم نہیں دیا کہ تمہاری روزی لکھ دی گئی ہے، ضرور آکر رہے گی، اسی پر اعتماد کئے رہنا بلکہ نبی علیہ السلام نے حکم دیا کہ جنگل جا کر لکڑی کاٹیں اور لکڑیوں کا گھٹر بازار میں فروخت کر کے معاش کا انتظام کریں۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: لأن یحتطب أحدکم حزمۃ علی ظھرہ فیبیع فکیف اللہ بہ وجھہ خیر من أن یسأل الناس، أعطی أم منع (بخاری حدیث نمبر: ۲۳۷۳)

حافظ ابونعیم اصفہانیؒ نے حلیۃ الاولیاء میں حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل فرمایا ہے: وبلغنا أن عمر بن الخطاب، قال: من عمل منکم حمدناہ ومن لم یعمل اتھمناہ، وقال: یا معشر القراء ارفعوا رؤوسکم ولا تزیدوا الخشوع علی مافی القلب، استبقوا الخیرات ولا تکونوا عیالا علی الناس (ج ۷ ص: ۱۷)

لہٰذا رزق مکتوب پر مکمل اعتماد و ایمان ہو اور رزق مطلوب کی تلاش میں لگا جائے یہی تقدیر و تدبیر کی افراط و تفریط سے پاک راہ ہے۔ [۱۵]

۲) مدیر محترم نے یہ تحریر فرمایا ہے: جب کہ اصحاب صفہ کی غربت و تنگی کا آج کوئی خادم دین تصور بھی نہیں کر سکتا۔

مدیر محترم! اصحابِ صفہ کی تمثیل دے کر یا ان کا نام لے کر کیا تصور دینا چاہتے ہیں؟ [۱۶] اصحابِ صفہ ہمارے لیے یقیناً قابل احترام اور قابل تأسی ہیں لیکن یہ موازنہ و مقایسہ اولاً اس لیے صحیح و کامل نہیں کہ اصحاب صفہ کی غربت و تنگی کا حال ابتداء اسلام کا تھا لیکن بعد میں جب فتوحات کا دور شروع ہوا تو الحمدللہ یہ حالت نہیں رہی اور یہ زمانہ تو الحمدللہ فتوحات اور خوشحالیوں کا ہے، آج کے زمانہ میں اس طرح کے تنگی کے حالات ہیں، لہٰذا حالت یُسر کا قیاس کرنا حالتِ عُسر پر اور حالتِ سعہ کا حالتِ ضیق پر یہ قیاس مع الفارق ہوگا جو غیر مقبول و مردود ہوتا ہے۔ [۱۷]

---

۱۵ نمبر ایک کے تحت ناقد محترم نے جو کچھ توضیح فرمائی ہے وہ بھی لایضع الامور مواضعھا کے مصداق ہے؛ مدیر نے اپنے مضمون میں پہلے رزق کے آسمانی نظام کو ایک سرسری ترتیب میں دکھانا چاہا کہ بنیادی طور پر روزی رساں اللہ تعالیٰ ہے اور اس نے اپنی حکمتِ بالغہ سے اس کی تقسیم میں بسط و قدر کو یکسانیت سے بہتر سمجھا ہے، چنانچہ بعض بندے بسط کے تحت آئیں گے اور بعض قدر کے تحت اور یہ سب اس کے عدل و رحمت ہی کا تقاضہ ہے؛ کھلی آنکھوں دیکھا جا سکتا ہے کہ بعض لوگ تمام تدابیر اختیار کر کے بھی محتاج و دست نگر ہیں اور بعض بیٹھے بٹھائے بے حساب کما رہے ہیں، اس لئے اجملوا فی الطلب و توکلوا علیہ کی نبوی راہنمائی خدامِ دین کے لائق شان ہے؛ یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ ترکِ اسباب اور ترک طلب کر کے خدمتِ دین پر لگ جانا چاہئے، مدیر نے نہ رزقِ مکتوب و مطلوب سے بحث کی تھی نہ ترکِ اسباب کی کہیں ترغیب دی تھی، نہ لکڑیاں کاٹ کے لا کر بازار میں فروخت کرنے سے منع کیا تھا، نہ نرے توکل کی تسبیح پڑھائی تھی، جو خلاصہ آخری سطر میں ناقد محترم نے افراط و تفریط سے پاک نکالا ہے مدیر ناقص و عاجز نے بھی بس یہی بات ملحوظ رکھنے کی تلقین کی تھی، اس کے باوجود بھی نہ معلوم کیوں مدیر کو رزقِ مکتوب و مطلوب میں فرق نہ کرنے کے خبط و سطح میں مبتلا قرار دے دیا گیا۔

۱۶ میں نے آیت کے ذیل میں شانِ نزول کا تذکرہ صرف یہ بتلانے کے لئے کیا کہ غربت اور بے سر و سامانی کی ناقابل تصور حالت میں بھی جب انہیں یہود کے تمول و ترفہ پر رشک آیا تو اللہ تعالیٰ نے ولکن ینزل بقدر ما یشاء انہ بعبادہ لخبیر بصیر کہہ کر انہیں تسلی دی کہ کمی بیشی میں نے خود تکوینی مصلحت سے رکھی ہے اور میں سب کے حالات سے باخبر ہوں؛ خدام دین کی حالت آج اگرچہ اہل یُسر کے مقابلے میں کم سے کم تر ہے مگر اصحابِ صفہ کے مقابلے میں بلکہ آج کے بھی کم از کم پچاس فیصد مسلمانوں کے مقابلے میں ہزار درجہ بہتر ہے، جب ان کو اللہ تعالیٰ نے بجائے تمنا پوری کرنے کا تیقن دینے کے اپنی مشیت پر اعتماد کرنے کی تعلیم دی تو ہمیں بھی اس سے تسلی حاصل کرنی چاہیئے؛ اب (تاصل و تجرّد یا ابتدائی و انتہائی حالات) سے اُس مقصد کے حصول میں کوئی بحث نہیں جو مدیر کے مدنظر تھا، ناقد محترم نے اس وضاحت اور اصحابِ صفہ کی تعریف و تعارف میں بلاوجہ ہی وقت ضائع کیا۔ (۱۷ اگلے صفحے پر)

خود نبی علیہ السلام بھی اپنے اصحاب سے فرمایا کرتے تھے کہ میرے پاس تمہاری ضرورت پوری کرنے کے لیے اب کچھ نہیں ہے، فلاں جگہ سے یا کہیں سے آجائے گا تو تم کو ضرور دوں گا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیا بھی ہے۔

آج کے کشائش وخوش حالی کے دور میں خدام دین کو ضروریات کے لیے بھی نہ دینا اور ضروریات کی تکمیل کو بھی تنگ کر دینا یہ نہ اسوۂ نبوی ہے اور نہ مزاج شریعت، بلکہ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ خدام دین کی خوب سے خوب تر خدمت کی جاتی اور تکمیلِ ضروریات کا بھرپور خیال کیا جاتا،[۱۸] جن خدام دین کے قدموں کے نیچے فرشتے پر بچھاتے ہیں ہم اپنی دنیا ان کے آگے نچھاور کر دیتے، بحر کی مچھلیاں جن کے لیے دعا کرتیں ہیں ہم بَروالے ان کے دوا کا انتظام کرتے، لیکن یہاں تو صورت حال بالکل منعکس نظر آرہی ہے۔

خدام دین غیر تو غیر اپنوں کی بے توجہی کا شکار اور اپنوں کی کرم فرمائیوں سے محروم ہیں۔[۱۹]

شعر

آپ ہی ذرا اپنے جور وستم کو دیکھیں[۲۰] ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

اور ثانیاً یہ قیاس اس لیے صحیح نہیں کہ اصحاب صفہ سے تمثیل کے لیے تطبیق بھی تو ضروری ہے اور تطبیق ندارد، مقیس اور مقیس علیہ ایک نہیں ہے، اس لیے کہ اصحاب صفہ وہ لوگ ہیں جن کا کوئی گھر بار وغیرہ

---

۱۷ بشرطیکہ ایسا ہوتا؛ جب مدیر کا کہنا یہ ہے کہ اُس وقت بھی اہل دنیا کے مقابلے میں خدام دین کی اکثریت قلیل المعاش تھی اور اب بھی اہل دنیا کے مقابلے میں خدام دین کی یا فتیں کم سے کم ہیں؛ بلکہ اب وہ تنگیاں نہیں ہیں جو سلف کی زندگیوں میں تھیں؛ پوری تاریخ خدام دین کی شاہد ہے کہ باستثنائے چند دین کے خدمت گذاروں کو معاشی آزمائشوں کا سامنا رہا مگر اسی کے ساتھ حق تعالیٰ کا دستِ غیبی ان کی بھرپور مدد کرتا رہا حالات کے حوالے کبھی نہ ہونے دیا تو اس میں کیا قیاس مع الفارق ہوگیا؟

۱۸ ناقد کی یہ بات بالکل واقعی اور واجبی ہے؛ ہونا یہی چاہیئے نہ ہونا افسوسناک بھی ہے قابل اصلاح بھی ہے، مگر مدیر نے خدام دین کی نصیحت کے لئے جو کچھ لکھا تھا وہ اس صحیح بات کی وجہ سے ناقد کی نظر میں غلط اور قابل رجوع کیسے ہوگیا؟

۱۹ سوال یہ ہے کہ ان اپنوں کی نشاندہی اور براہِ راست مخاطبت اور توجہ دہانی کے بجائے مدیر کی تردید وتغلیط ہی کو کیوں ضروری سمجھا گیا؟ اور اگر خدام دین کی زبوں حالی کا براہِ راست مدیر ذمہ دار اور مجرم ہے تو ناقد محترم تنقید سے پہلے اس سے رجوع کرتے، تبادلہ خیال کے بعد یا جناب کی غلط فہمی دور ہوتی یا مدیر کو اپنے قصور کا اعتراف ہوتا؛ اس رجوع کے بغیر ہی موردِ الزام ٹھیرا کر خدام دین سے اس کی خیر خواہی کو الفاظ وعبارات کی ہیرا پھیری کا نام دینا کونسے دین ودیانت کا تقاضہ ہے؟

۲۰ ناقد محترم کے ذمے ہے کہ سرسری الزام تراشی ونکتہ نوازی سے آگے بڑھ کر مدیر کے جور وستم کی تفصیل بہ دلیل سامنے لائیں ورنہ موازین القسط کے قائم ہونے کا انتظار کریں، فانتظروا انی معکم من المنتظرین۔

نہیں تھا اور بیوی بچے وغیرہ بھی نہیں تھے، جن اصحاب صفہ کا نام لے کر خدام دین کو ترغیب دی جارہی ہے وہ بے چارے تو گھر بار والے، اہل وعیال والے ہیں، لہٰذا قیاس کیسے صحیح ہوگا؟ بات خدام دین کی صرف اپنی ذاتی ضروریات کی ہوتی تو اصحاب صفہ سے تمثیل درست ہوتی لیکن یہاں ان کی اپنی ذاتی ضروریات سے ہٹ کر، گھر والوں اور بیوی بچوں کی ضروریات بھی تو ہیں، خدام دین کو ان سب کی ضروریات بھی تو پوری کرنی ہے اور وابدأ بمن تعول کا فریضہ بھی تو ہے۔

مدیر محترم! اب آپ ہی بتائیں کہ اصحاب صفہ تو صرف تنہا تھے اور خدام دین پر تو اوروں کی ذمہ داری بھی تو ہے، وہ کیسے ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں؟

صرف اصحاب صفہ کا تذکرہ کر دینے سے یا کچھ ترغیبی واقعات بتا دینے سے یا کچھ قربانیوں کا ذکر کر دینے سے یا حسین جملوں وتعبیرات اور مزین الفاظ کی ہیرا پھیری سے وقتی طور پر ان کے آنسو تو پوچھے جا سکتے ہیں، لیکن ان کی حقیقی ضروریات پوری نہیں ہو سکتیں اور نہ ان کی ذمہ داریوں کا بوجھ ختم ہو سکتا ہے۔

جب تک کہ حقیقت پسندانہ ٹھوس اقدامات نہ کئے جائیں اور تدبیری طور پر ان کے سطح معاش کو بلند نہ کیا جائے اس وقت تک یہ مسئلہ حل ہونے والا نہیں ہے[۲۱]۔ وعظ وتقریر سے اور ترغیب وتحضیض سے اپنے دل کی تسلی اور خیالی اطمینان تو ہو سکتا ہے پر حقیقی دنیا میں مسئلہ سلجھ نہیں سکتا۔

اصحاب صفہ کی جو تعریف ہم نے اوپر ذکر کی ہے وہ ایجادِ بندہ اور خود اختراعی نہیں ہے بلکہ حوالوں سے مدلل اور کتب معتبرہ سے مبرھن ہے، ملا علی قاریؒ نے شرح مشکوٰۃ میں صفہ اور اہل صفہ کی تعریف ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔وفی القاموس: أهل الصفة كانوا اضياف الاسلام يبيتون فی صفة مسجده عليه الصلاة والسلام، وفی حاشية السيوطی علی البخاری عدهم أبو نعيم فی الحلية أكثر من مائة، والصفة مكان فی مؤخر المسجد أعد لنزول الغرباء فيه من لا مأوی له ولا أهل، وقال ابن حجر: وكانت هی فی مؤخر المسجد معدة لفقراء أصحابه الغير المتأهلين (مرقاة المفاتيح، الجزء الخامس ص: ۵ مطبوعه فيصل ديوبند)

اس میں من لا مأوی له ولا أهل اور الغير المتأهلين قابل غور ہیں، اسی کو پیش نظر رکھ کر ہم

---

۲۱ پورے مضمون میں یہ ڈیڑھ سطر ہے جو ناقد محترم کا منشائے تحریر ہے مگر نہ معلوم کیوں اسی کو غیر ضروری اور غیر متعلقہ بحثوں کے ڈھیر میں چھپا دیا گیا؛ گفتگو کا موضوع اور مضمون کا عنوان اسی کو بنا کر واضح طور پر پیش کیا جاتا کہ یہ کام کیسے کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے تو واقعی آپ کا مضمون کام کی بات اور وقت کی ضرورت ہوتا۔

نے اوپر اصحاب صفہ کی تعریف کی ہے، نیز علامہ ابن الاثیر جزریؒ النہایۃ فی غریب الحدیث میں اصحاب صفہ کی جو تعریف فرمائی ہے اس میں بھی یہ لکھا ہے کہ ان کا گھر وغیرہ کچھ نہیں ہوا کرتا تھا، لکھتے ہیں: **أهل الصفة: هم فقراء المهاجرين ومن لم يكن له منهم منزل يسكنه، فكانوا يأوون الى موضع مظلل في مسجد المدينة يسكنونه (النهاية في غريب الحديث ص: ۶۹۷ مطبوعة مؤسسة الرسالة ناشرون)**

۳) مدیر محترم نے مال کمانے کے مقصود پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مال کمانے کا مقصود آیا خوش حالی اور حاجت برآری ہے یا کثرت اسباب وزیادتی مال؟ پھر آگے خود جواب دیا ہے۔۔۔۔۔۔پہلی بات ہی معتبر ہے کہ کسب مال کا اصل مقصود خوش حالی اور سکونِ قلبی ہے۔

ہمارا سوال یہ ہے کہ یہ مقصود یعنی خوش حالی کب حاصل ہوگی؟ ظاہر ہے ضرورت پوری ہونے پر ہی قلبی سکون ملے گا جب ضرورت ہی پوری نہ ہو تو خوشحالی اور سکونِ قلبی کا کیا مطلب؟

پوری بحث تو ضرورت کی تکمیل پر ہی تو ہو رہی ہے، جواب دینے میں مدیر محترم نے اصل موضوع یعنی تکمیل ضرورت سے راہِ فرار اختیار فرمایا ہے، موضوعِ سخن کو بدل کر قلم کو بے مقصد کی وادیوں میں لگا دیا اور مسئلہ کا حقیقی حل پیش نہیں کیا۔[۲۲]

۴) آگے مدیر محترم نے ضرورت کے معیارات پر بحث چھیڑی اور آگے اس کی کچھ تقسیمات بھی ذکر فرمائی ہے، ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ضرورت میں بھی معیارات ہوتے ہیں،[۲۳] ہاں راحت، کثرت اور اسراف کے معیارات ہوتے ہیں لیکن ضرورت تو (جو بنیادی ہے) سب کی یکساں ہوتی ہے۔

گھر کی ضرورت: اناج غلہ کی ضرورت، تیل گیاس کی ضرورت، اہل خانہ کا بنیادی خرچ ونفقہ، حمل وولادت کے اخراجات، اولاد کی پڑھائی اور اسکولنگ کے خرچے، بیماریوں میں دوا دارو والے اخراجات، اور ایک شہری زندگی میں سادی سی ٹو ویلر گاڑی اور ایک سادہ سے موبائیل فون، نیز گاڑی کا پٹرول خرچ اور فون کا کفاف والا ریچارج یہ سب بنیادی اخراجات اور لابدی ضروریات ہیں۔

جناب مدیر محترم! اب آپ ہی بتائیں کہ سات آٹھ ہزار میں یہ بنیادی ضرورتیں کیسے پوری

---

۲۲ مسئلے کا حقیقی حل مدیر نے نہیں بتلایا اور راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے بے مقصد وادیوں میں بھٹک گیا تھا تو ناقد محترم اس پر کلام فرماتے لیکن جناب نے بھی تو سارا زور غبارِ خاطر اتارنے میں لگا دیا اور حقیقی حل کو مبہم ومخفی کر دیا۔

۲۳ جی ہاں! ضرورت کے بھی درجات ہوتے ہیں کوئی چیز بہت زیادہ ضروری ہو سکتی ہے کوئی کم ضروری بھی ہو سکتی ہے، پھر بھی مدیر نے نو فارغ علماء کو مخاطب کرتے ہوئے یہ سمجھانا چاہا تھا کہ ضرورتوں کی تعیین میں لوگوں کی عقل کے معیارات الگ الگ ہوتے ہیں، اور علم وفہم نیز تجربات کی کمی بیشی سے کسی بھی چیز کی تعیین میں کمی بیشی ہونا روزمرہ کی بات ہے، اب اس پر بھی کسی کو اعتراض ہو تو مدیر کیا کر سکتا ہے؟

ہوسکتیں ہیں؟ [۲۴]

کم سے کم کرایہ والے گھر کو تلاش بسیار کے بعد ڈھونڈ نکالا جائے تو تین ہزار تو کرایہ ضروری ہوگا، پانی اور لائٹ بل ملحق کرلیں تو ایک ہزار ہو کر آدھی تنخواہ یہیں ختم، باقی تین چار ہزار میں دال، چاول، تیل گیاس سلینڈر اور ہفتہ میں ایک بار گوشت کا خرچ اور بچوں کی اسکولی فیس، کتاب، کاپی اور ٹفن وغیرہ کا خرچ تو بقیہ چار ہزار کو ہاتھی کی طرح ایک ہی لقمہ میں نگل جائے گا، پٹرول خرچ، فون ریچارج، بیوی کا نفقہ، اچانک پیش آنے والی بیماریوں کے علاج وغیرہ کا خرچ اب یہ خادم دین کہاں سے پورا کرے گا۔ [۲۵]

مدیر محترم! آپ تو کہتے ہیں کہ ضروریات سے فارغ ہو کر مست و مگن ہو جائے گا، ہم نے اوپر ایک موٹا موٹا میزانیہ قائم کیا ہے، اس پر تو آپ کا یہ جملہ صادق نہیں آتا۔ [۲۶]

جو اس مسئلہ سے دوچار ہیں ان سے پوچھئے وہ آپ کو اپنی دلگداز و لرزہ خیز آنسوؤں سے بھری داستان اپنے ٹوٹے ہوئے دل سے سنائیں گے، کسی تجربہ کار سے معلوم کیجئے، **فاسئل بہ خبیراً** [۲۷]

شیشہ کے محل سرا میں بیٹھ کر جھونپڑ پٹیوں پر اور صرح ممرد من قوارید میں جلوہ گر ہو کر گھانس پونس کے آشیانوں پر پتھر نہ مارنا، رکوب علی المیاثر کر کر مشی علی الاَ قدام کرنے والوں اور سیکل سواروں کا کسر قارورہ نہ کرنا (یعنی دل نہ توڑنا) یعنی مست و مگن زندگی والی بات نہ کہنا۔ [۲۸]

---

۲۴ اس کے لئے مدیر نے تو کسی بھی جائز ذریعے کو اختیار کرنے سے نہیں روکا تھا، ہاں! پھر بھی تنگی ہو تو ہمت و حوصلے سے کام لینے اور کشائش کے وعدۂ الٰہی پر نظر رکھنے کی ترغیب دی تھی۔

۲۵ کیا یہ سب ضرورتیں خدام دین کسی نہ کسی طرح پوری نہیں کر رہے ہیں؟ لاکھوں سے بہتر طریقے پر پوری کر رہے ہیں ہاں! یہ صحیح ہے بہ سہولت پوری نہیں کر پا رہے ہیں مگر یہ حال صرف خدام دین کا نہیں ہے کروڑوں مسلمان اسی صورتحال کا شکار بلکہ اس سے بدتر صورتحال میں مبتلا ہیں؛ جب ہم انھیں تقدیر سے راضی رہنے اور صبر سے کام لینے کو کہتے ہیں تو خود ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟

۲۶ جس خوش حالی اور مستی کا میں نے ذکر کیا تھا وہ خدام دین کی قلت یافت میں وسعتِ برکت کے تجربات و مشاہدات کے حوالے سے کیا تھا، آپ کے میزانیئے کے حوالے سے تو خیر پچیس تیس ہزار میں بھی گذارہ مشکل ہے۔

۲۷ مدیر عاجز تقدیرِ الٰہی سے ان درد بھرے حالات سے خود گذر چکا ہے، کسی اور تجربہ کار سے معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ہے، یہ بھی مقامِ شکر ہے کہ توفیق الٰہی نے کبھی زبانِ شکایت کھلنے نہ دی، ایسے مواقع پر بڑوں نے وہی تسلی دی جو میں نے گذشتہ ادارئے میں اپنے چھوٹوں کو دینی چاہی، اسی تسلی اور تشکر کی برکت سے عمر کے آخری مرحلے میں من جانب اللہ وہ فتوحات حاصل ہوئیں کہ عوام تو عوام علماء کی آنکھوں میں بھی کھٹکنے لگیں؛ اسی تجربے کی روشنی میں اپنے چھوٹوں کیلئے بھی یہی چاہتا ہوں کہ صبر و شکر کے ساتھ تھوڑا انتظار کرلیں، پھر دیکھیں کہ مخلوق تو جہ کرے نہ کرے مولائے مہربان کن کن مہربانیوں کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے، اور اگر یہ باتیں خود فریبی اور طفل تسلی کی قبیل سے ہیں تو میں کسی کو اسباب و ذرائع میں لگنے سے کب روک رہا ہوں، لیکن کوئی مجھ سے پوچھے تو میں وہی بتاؤں گا جو میں اپنے بڑوں سے سنا اور خود آنکھوں سے دیکھا ہے۔ (۲۸ اگلے صفحے پر)

مدیر محترم! خدام دین، ذمہ داران مدارس سے اور اپنے بڑوں سے کوئی پر تعیش زندگی کے طالب نہیں ہیں وہ ایر کنڈیشن گھر اور کار کے متمنی نہیں ہیں، وہ لینین کے کپڑوں اور بھاری کھادی کے کفـــ لگائے ہوئے کپڑوں کے خواہش مند نہیں ہیں وہ راڈو (Rado) گھڑی، سیمسنگ (Samsung) یا آئی فون (IPhone) اور بھاری دیدہ زیب بڑے بڑے چشموں کی حرص اپنے دلوں میں لئے ہوئے نہیں ہیں، اور نہ ہی وہ آئی پیاڈ (I Pad) لیاپ ٹاپ (Lap Top) اور کریڈٹ کارڈس کا ان بڑوں سے سوال کر رہے ہیں، یہ بچارے تو اپنی بنیادی ضرورتوں کی التجاء اور اس کی تکمیل کی درخواست لے کر پہونچیں ہیں، لیکن آپ نے پتہ نہیں اُنہیں کیا کیا جواب دیدیا؟ آپ نے اُنہیں پُر تعیش زندگی کے طالب سمجھ کر اُسی کے مطابق جواب دیدیا، کبھی تو عدم قناعت کا الزام دیدیا تو کبھی کم فہموں وسطح بینوں کے تمغہ سے سرفراز فرمادیا اور کبھی قلتِ صبر وقلتِ اعتماد کی پھبتی کس دی، لیکن یاد رکھئے یہ منصفانہ، عادلانہ اور محققانہ جواب نہیں ہے۔[۲۹]

یہ جواب تو ایسے ہی ہے جیسے مشہور کہاوت ہے تھوڑے سے تغیر کے ساتھ ’’**تاویل السوال بما لا یرضی به سائله**‘‘[۳۰] سائل ضرورت کا سوال کر رہا ہے اور مجیب صاحب تعیش کو سامنے رکھ کر جواب دے رہے ہیں، **فیا لله العجب ، من مجیب لا یجیب علی وفق السوال ولا یهتدی الی الصواب**۔

---

۲۸ یہ انداز بتلاتا ہے کہ ناقد محترم کا قلم نہ تو مقابلہ آرائی اور شخصی حملہ و دل آزاری نہ کرنے کا وعدہ پورا کر سکا نہ ہفوات و ہذیانات سے قلم کو محفوظ رکھ سکا نہ مدیر کا احترام تسلیم ہونے کی بات سچی نکلی؛ بلکہ سب رسمی باتیں تھیں، یہ اور بات ہے کہ یہ اور مابعد کی تنقید برائے تنقیح سے آپ کی بڑی جماعت کا کچھ بار دل ہلکا ہو جائے تو میرے لئے سعادت ہے۔

۲۹ سائل نہ مدیر کے ماتحت کام کرتا ہے نہ اس کا سوال تنخواہ بڑھانے سے متعلق تھا نہ وہ اپنے حوائج وضروریات کی فریاد لے کر مدیر کے سامنے آیا تھا نہ وہ اپنے بڑوں کی شکایات کر رہا تھا، وہ مجھ سے حالات کی بنیاد پر اپنی تازہ خدمات اور پیش آمدہ حالات کے حوالے سے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آیا ایسے حالات میں صبر ہی سے کام لیتے رہیں یا کوئی دوسرا راستہ از دیادِ آمدنی کا اختیار کر لیں؟ اس کے جواب میں مدیر نے دونوں راہوں کی گنجائش دکھائی لیکن استقامت کے برکات وفوائد بھی بتلادئے کہ ہمت سے کام لو تو آخرت کا اجر دنیا کی راحت سے بہتر ہے؛ سوال کی جو تشریح آپ نے کی ہے وہ نکتہ بعد الوقوع ہے، سطح بیں اور کم فہم سے مراد مدیر کے نزدیک وہ عوام اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ تھا جو خدام دین کی جز معاشی پر تبصرے کرتا رہتا ہے، آپ نے اس کا مصداق اپنے کو ٹھیرالیا تو اس میں مدیر کا کیا قصور؟ میرا جواب محققانہ تو یقیناً نہ ہوگا کہ سطحی العلم ہوں، انصاف وعدل سے مبرا بھی ہو سکتا ہے اس لئے کہ میں متعدد جوابوں کا موازنہ نہیں کر رہا تھا، البتہ ناصحانہ ضرور تھا اور وہی میرا مقصود تھا، اب اگر اُسے کوئی اپنی جھونپڑیوں پر محل سراؤں سے کی گئی سنگ باری سمجھتا ہے تو یہ وہی اختلافِ نظائر ہے جس سے انشاء اللہ اقتراب الی الحق وجود میں آجائے گا۔

۵) مدیر محترم نے بڑوں کی فتوحات کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز فرمایا ہے: ''بڑوں کی فتوحات اور غیبی عنایات کو دیکھ کر شروع ہی سے اپنے لیے اسی زندگی کو معیار بنالیا جاتا ہے الخ''

بار بار ہم مدیر محترم کی یہ غلط فہمی کا ازالہ کر چکے ہیں کہ خدام دین عیش وراحت، تعیش وترفہ نہیں چاہتے وہ تو بس اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل چاہتے ہیں۔ [۳۱]

مدیر محترم نے اپنا ذہن ایسا بنالیا ہے کہ جو کوئی اپنی ضرورت کی بات کرے تو اُسے راحت وعیش کوشی اور تعیش پر محمول کیا جاوے اور اُسی کا حکم ضرورت پر لگا دیا جائے گا حالاں کہ ضرورت وتعیش میں بعد المشرقین والمغربین ہے۔ [۳۲]

---

۳۰ مدیر نے اپنی کم عقلی سے سوال کا جو مطلب سمجھا اسی کے مطابق جواب دیا، قلتِ یافت اور تنگیٔ معاش کے حل میں اگر یہ کہا جائے کہ جو بلند حوصلگی سے کام لے کر حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے دین کی خدمت پر جم جاسکتا ہے وہ ایثار اور صبر سے کام لے کر خدمتِ دین میں لگا رہے، اس کے لئے اپنے بڑوں کے احوال وعزائم سے قوت حاصل کرے، ایسے بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نصرت کی جو سنتِ جاریہ ہے اس کا یقین رکھے، اور اگر شخصی وخانگی احوال اجازت نہ دیں تو کسی جائز ذریعہ معاش کو اختیار کرتے ہوئے دین کی ممکنہ خدمات کرلے تو اس جواب میں کیا عدم مطابقت نظر آرہی ہے؟ اور اس جواب سے ناقد کو کیوں اتنی اذیت ہو رہی ہے؟

۳۱ ناقدِ محترم! بار بار اس ناشکری وناقدری کو مت دھرائیے، ہمیشہ اوپر دیکھنے کے بجائے ذرا نیچے بھی نظر ڈالیئے، اللہ تعالیٰ نے کروڑوں بندوں اور بڑے بڑے پڑھے لکھوں، ڈگری ہولڈروں سے کہیں اچھی حالت میں خدام دین کو رکھا ہے، یہ صحیح ہے کہ مُسرفین ومُترفین سے بہت کم ہیں لیکن جن بنیادی ضرورتوں کی آپ بار بار دہائی دے رہے ہیں خدا کو حاضر وناظر جان کر اپنی غیرت کو سامنے رکھ کر بتائیے کہ کیا خدامِ دین ان ضرورتوں کے حصول میں کروڑوں بندگانِ خدا سے بہتر حالت میں نہیں ہیں؟ مدیر عاجز اپنی عمر کی چھٹی دہائی ختم کرنے جارہا ہے، ملک کے طول وعرض اور شرق وغرب میں گھوم چکا ہے، ایک مدرسہ کے سائے میں پیدا ہو کر اٹھاون برس مدارس اور مدارس والوں کے ساتھ گذار چکا ہے، شہروں سے لے کر قصبوں تک کہ خدامِ دین سے تعلق رکھتا ہے؛ میں علی رؤوس الاشہاد کہہ سکتا ہوں کہ خدامِ دین ـــــ بعض علاقوں کے استثناء کے ساتھ ـــــ ویسی کس مپرسی میں نہیں ہیں جیسی جناب اپنی تحریر میں دکھا رہے ہیں؛ میں یہ نہیں کہتا کہ ان کی خدمت ونصرت میں اضافہ نہیں ہونا چاہیئے اور یُسر وسہولت پیدا کرنے کی طرف توجہ دینے کی ضرورت نہیں ہے، یہ ایک مستقل موضوع ہے جس پر کہا لکھا اور غور کیا جانا چاہئے مگر اس کے مخاطب خدامِ دین نہیں ہیں، سربراہانِ مدارس ومساجد ہیں، میرے مخاطب تو خدامِ دین تھے آپ کو مُدیر سے کوئی شکایت ہے تو کھل کر سامنے آئیے اور براہِ راست مخاطب کیجئے اس سے زیادہ تلخ وتند لہجہ اختیار کیجئے مگر خدامِ دین پر حق تعالیٰ کے بے پایاں افضال واحسان کا اعتراف بھی کیجئے، یوں بُھک مروں اور خانماں بربادوں کی شکل میں اُنھیں نہ دکھائیے، بغض معاویہ کے اظہار کے لئے حُبِ علی کا سہارا نہ لیجئے، کیا میں (سائل کے بقول) یہ تسلیم کرلوں کہ مدرسین ومعلمین اور ائمہ وخطباء تین وقت کے بجائے ایک وقت کھانے، سال بھر میں ایک آدھ جوڑے پر اکتفاء کرلینے اور پندرہ دن میں بھی ایک مرتبہ گوشت نہ کھاسکنے کی صورتحال سے گذر رہے ہیں یا (ناقد کے بقول) سادہ سی ٹو ویلر، سادہ سا موبائیل، اور بہ قدر کفاف ری چارج سے بھی محروم ہیں ہوگا کوئی کوئی ایسا بھی لیکن کیا عام طور سے یہی صورتحال ہے؟ یا اُنہیں فضولیات اور وسائل کے بے جا استعمال پر روک ٹوک اور بار بار تنبیہ کرنی پڑ رہی ہے؟ (۳۲ اگلے صفحہ پر)

خدام دین نے اکابر کی فتوحات اور مرفہ الحالی کو اپنا نمونہ اور اسوہ نہیں بنایا ہے اگر ایسا ہوتا تو جب تک کار نہ ملتی، اسٹیج نہ سجتا، ان کے لیے قطاریں نہ لگتیں اور ترفہ وخوشحالی نہ ملتی تب تک وہ دین کی خدمت ہی نہ کرتے لیکن یہ سب پر عیاں ہے کہ خدام دین ان میں سے کچھ نہ ہونے کے باوجود پوری قربانیوں اور جذبات کے ساتھ اپنے دینی کام میں لگے ہوئے ہیں اور الحمدللہ ان کی خدمات سے دینی کاموں کا سلسلہ رواں دواں ہے۔[۳۳]

مدیر محترم نے جن بڑوں کا ذکر کیا ہے یا کرتے رہتے ہیں، اُن بڑوں کو بھی دیکھنا چاہئے کہ وہ بڑے کیسے تھے؟ صرف بڑوں کا نام لے لینے سے یا تذکرہ سے کام نہیں چلے گا۔

وہ بڑے ایسے بڑے تھے جو چھوٹوں کا مکمل خیال رکھنے والے اور اپنی فتوحات میں ماتحتوں اور خدام کا حصہ رکھنے والے، متاع دنیا اور اسباب عیش ان کے دلی آرزوؤں کی منتہی نہیں تھے، وہ تو ان چیزوں کے سمٹ آنے اور جمع ہوجانے پر ناخوش اور تقسیم وتفریق کردینے پر خوش ہوا کرتے تھے بلکہ ٹھکانے لگا دینے کے بعد ہی چین کی سانس اور آرام کی نیند لیا کرتے تھے۔[۳۴]

ان اکابر کا مزاج تو ایسا تھا کہ فتوحات کی کثرت کے نتیجہ میں مال غنیمت کے انبار کو دیکھ کر رویا کرتے تھے، کسی کے کہنے پر کہ یہ تو مقام تشکر ہے نہ کہ مقام بکاء تو ان کے مزاج فقیرانہ اور نگاہِ متفرسانہ (فراست والی نگاہ)

---

۳۲ جی نہیں! مدیر نا محترم نے ایسا کوئی ذہن نہیں بنالیا ہے، مدیر خدام دین کی ہر تکلیف کو الحمدللہ سنتا ہے اور اس کے ازالہ کے لئے دائرہ اختیار واسباب میں بساط بھر سعی کرتا ہے۔ فسئل بہ خبیرا؛ البتہ ناقد فاضل نے شروع ہی میں ایسا ذہن دکھادیا ہے کہ مدیر ایران کو توران، حوائج کو زوائد اور ضروریات کو تعیّشات سمجھنے کی سطح وخبط میں مبتلا ہے، اس لئے اس کی ہر بات جو بالکل خالی الذہن رہ کر محض خیر خواہی کے جذبے سے لکھی تھی وہ الفاظ کی تک بندی اور عبارات کی ہیرا پھیری کا کھیل گویا فریب ودھوکہ دہی کی چال نظر آنے لگی۔

۳۳ اور مدیر کا شمار خدام دین میں نہیں ہے، اس کو دین کے اس کارواں کی روانی دوانی میں کوئی نصیبہ نہیں ملا ہے، کیوں کہ وہ تو بقول ناقدِ فاضل کے اسباب تعیش سے مالا مال، برانڈڈ اشیاء کا حریص ہوکر اور خدام دین پر جور وستم کو روا رکھ کر شیش محلوں (صرح ممرد من قوارير) میں عشرت کی زندگی گذار رہا ہے؛ بلکہ ان عیش کدوں سے غریب خدام دین پر پتھر پھینک رہا ہے، فالی اللہ المشتکیٰ۔

۳۴ مدیر نے جن اکابر کی مثال پیش کی تھی وہ وہی اکابر ہیں جو آپ کے اساتذہ ومشائخ میں بھی موجود ہیں، کیا ان کا بھی وہی حال ہوگیا ہے جو آپ نے تحریر کیا ہے، مجھے تو اب بھی اکابر اسی شان میں نظر آرہے ہیں جس کی آپ نے تصویر کھینچی ہے، اگر آپ کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ مدیر نے اکابر کہہ کر اپنے کو مراد لیا ہے تو معلوم ہونا چاہیے کہ ایسا نہیں ہے، مدیر اپنی پستیٔ اخلاق کا دوسروں سے زیادہ واقف ہے، جو کچھ لکھ دیتا ہے وہ حق المسلم سمجھ کر لکھتا ہے نہ کہ برتری وپارسائی جتانے کے لئے؛ اور جہاں تک یہ بات ہے کہ مولائے مہربان کی طرف سے عطا شدہ فتوحات اور نعمتوں کو اپنے لئے مختص نہ کرلینے خدام دین اور غرباء مسلمین کو شامل رکھنے میں یہ عاجز سلف کی اتباع کررہا ہے یا نہیں وہ خدائے علیم وخبیر جانتا ہے وقت آنے پر زبانِ خلق بھی بولے گی، ان شاء اللہ۔

نے یہ جواب دیا تھا کہ یہ چیزیں جمع کرنے اور دل لگانے کی نہیں ہیں، یہ تو اسبابِ ہلاکت اور سامانِ تباغض وتحاسد ہیں۔

علامہ ابن کثیرؒ البدایہ والنہایہ میں واقعہ تحریر فرماتے ہیں: **فلما نظر (أی عمر) الی یاقوته وزبرجده وذهبه الأصفر و فضته البیضاء بکی عمر ،فقال له عبدالرحمن :مایبکیک یاامیر المؤمنین؟فواللہ ان هذا الموطن شکر فقال عمر: واللہ ماذاک یبکینی، وتاللہ ما أعطی اللہ هذاقوما الا تحاسدوا وتباغضوا، ولا تحاسدوا الا ألقی بأسهم بینهم** (البدایه والنهایة، جز ۷ ص: ۷۲ مطبوعه دار الکتب العلمیه)

وہ اکابر دورِ حاضر کے علماء کے مانند آستار کعبہ کی طرح پوشاکیں نہ پہنا کرتے تھے اور نہ بدلا کرتے تھے اور ان کے خوان نعمت پر مرغن ومتلون ہمہ اقسام کی متعدد تھالیں وطشتیں صبح وشام گردش نہیں کیا کرتی تھیں، یعنی **یغدی ویراح علیکم بالجفان** کے مصداق نہیں ہوا کرتے تھے جو عدم خیر کی علامت ہے۔ ۳۵

۶) مدیر محترم نے خدام دین کی بہت بڑی کمزوری اپنی حیثیت سے زیادہ حیثیت والی لڑکیوں سے نکاح کرنے کو بتلایا ہے، لکھا ہے: ''اسی طرح ایک کمزوری یہ ہے کہ نکاح اپنی حیثیت سے زیادہ حیثیت والی لڑکی سے کرتے ہیں، غور کیا جائے تو خدام دین کی ساری پریشانیوں کا سرچشمہ یہی غلطی ہے''

---

۳۵ دورِ حاضر کے علماء سے آپ کے مشارالیہم کون ہیں؟ آپ کے اساتذہ ومشائخ تو جہاں تک میں سمجھتا ہوں نہیں ہوسکتے کہ کوئی بدنصیب بھی اساتذہ ومشائخ پر ایسا تبصرہ نہیں کرتا، ایسے علماء کتنے ہیں اور کہاں رہتے ہیں جن کا مشغلہ تن پروری، اور پیٹ پوجا کے علاوہ کچھ نہیں؟ اور اگر ہیں بھی تو ان سے شکایت کی وجہ کیا ہے؟ اگر وہ قومی خزانوں اور عوامی امانتوں میں تصرف وتغلب کے ذریعہ تعیش کررہے ہیں ـــــ جن کا آپ نے گھر کے صحنوں سے لے کر خلوت گاہوں تک، جسم کے کپڑوں سے لے کر دسترخوان کے مینو تک اور پیر کے جوتوں سے لے کر آنکھوں کے چشموں تک کا جائزہ پوری باریک بینی سے لے رکھا ہے ـــــ تو ان کے اس معیارِ زندگی سے ہزار بار پناہ مانگنی چاہیئے، قوت ہو تو ان کی اصلاح کرنی چاہیئے، قوت نہ ہو تو ابلاغ وتنذیر اور دعائے ہدایت کرنا چاہیئے؛ اور اگر ان کا یہ ترفہ وتمول حلال وطیب ذرائع سے ہے تو من حرم زینة اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق؟ مسلمانوں کی اچھی حالت قابلِ مسرت ہے نہ کہ لائقِ شکایت، وہ عالم ہو کہ عامی! خود اللہ تعالیٰ دیکھ کے خوش ہوتا ہے، یحب ان یری اثر نعمته علی عبده۔ ہاں! انہیں چاہیئے کہ اپنی نعمتوں کو دوسروں بالخصوص خدامِ دین تک متعدی کریں، نہ کریں تو ان کا عمل ہے، اس میں شکایت کیا ہے؟ آخر اللہ تعالیٰ ہی نے تو رزق میں بسط وقدر کو مقدر کیا ہے، البتہ اپنے لئے بھی اللہ تعالیٰ سے مانگنے یا جائز تدابیر اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

مدیر محترم! سوال میں مذکور ضرورت کی بات تو غارِ سرمن رائی میں چلی گئی اور آپ کی قلمکاری وفنکاری کے دبیز وحسین جملوں کی تہہ میں کہیں چھپ گئی۔

جواب تو بہر حال دینا تھا اس لیے اصل موضوع سے انحراف کرتے ہوئے غیر متعلق باتوں میں سائل کو الجھا دیا ہے، ہم مانتے ہیں کہ آپ کو وعظ و پند اور تقریر و ترغیب کا مکمل حق ہے لیکن کسی کے سرائر وضمائر کو جانے بغیر اور نیات ومقاصد کو معلوم کئے بغیر اس طرح کی باتیں کہہ دینا آپ جیسے مفکر و منتظم شخصیت کے لیے زیب نہیں دیتا۔ [۳۶]

ایک آدمی اپنے کفو کی لڑکی تلاش کرتا ہے تو اسپر کیا عیب وطعن؟ ایک خادم ادنیٰ گھرانے سے تعلق رکھتا ہے تو وہ اپنی حیثیت سے اور ایک متوسط اپنی اور ایک اعلیٰ گھرانے کا خادم اپنی حیثیت سے لڑکی تلاش کرتا ہے۔

اور خاص طور پر ہمارے علاقہ میں تو کوئی مالدار اپنی لڑکی کو ایک متوسط یا عام مولوی کو تو ہرگز نہیں دیتا، لہٰذا مدیر محترم کا یہ کہنا کہ مالدار بیوی کی تلاش کی جاتی ہے یہ حقیقت واقعہ کے خلاف ہے۔

ایک آدمی اچھے خاندان کی اچھی لڑکی اس لیے تلاش کرتا ہے کہ وہ سمجھ دار، پڑھی لکھی، تہذیب یافتہ اور اولاد کی بہترین پرورش وتربیت کرنے کے قابل اور اہل ہوتی ہے، اور فقہاء نے لکھا بھی ہے کہ ایسی لڑکی منتخب کی جاوے جو صالحہ، معروفۃ الحسب والنسب ہو، اور جو اچھے گھرانے کی لڑکیاں ہوتیں ہیں، سمجھدار ہونے کی وجہ سے حالات کو سمجھ کر شوہر کے مزاج میں رنگ جاتیں ہیں، شوہر کی حیثیت پر اتر آتیں ہیں اور اس کی یافت کی حیثیت پر اپنے آپ کو ڈھال لیتیں ہیں۔

کیا اس بات کی ترغیب دی جارہی ہے کہ جاہل گھرانہ کی اَن پڑھ، غیر شائستہ لڑکی سے نکاح کر کر اپنی زندگی کو اجیرن بنالیا جائے، اور ذہن ودماغ کا ٹینشن مول لیا جائے جس کا نتیجہ طلاق وٹکراؤ اور خاندان بکھراؤ کے علاوہ کسی اور شکل میں ظاہر نہیں ہوگا، جو دینی خدمات میں حارج بھی ہے اور بے عزتی وذلت کا موجب بھی ہے۔ [۳۷]

---

۳۶ خط کشیدہ عبارت کو ایک دفعہ آپ خود پڑھ کر غور کرلیں کہ مدیر کے ایک مثبت مضمون کا تنقید کے نام پر یوں ستیاناس کر دینا اور رجوع کی دعوت دینا اسی غلطی کا نتیجہ تو نہیں؟

۳۷ مدیر نے صرف یہ کہا کہ معاشی اعتبار سے اپنے سے فائق لڑکیوں سے نکاح کرنے کی وجہ سے خدام دین کو ان کے مطالبات اور مقتضیات کی فکروں میں پڑ کر ذہنی انتشار کا سامنا کرنا پڑتا ہے، یہاں صرف معاشی حیثیت کی بات کہی گئی ہے کہ علماء سے جوڑ نہ کھانے اور ان کا ساتھ نہ دے سکنے والی لڑکیوں کے انتخاب سے اہل علم کے گھرانوں پر جو بُرا اثر پڑ رہا ہے، وہ بھی خدام دین کی الجھنوں کے بڑھنے کا ایک اہم سبب ہے، واقعات ومشاہدات کے مدنظر یہ بات کہی گئی؛ جاہل گنوار اور پھوہڑ وبدتہذیب لڑکیوں سے نکاح کرنے کی۔۔۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

خدشات ومخاوف تو ہر دو پہلو میں ہیں لیکن یہاں قرآنی اصول و اثمھما اکبر من نفعھما کو پیش نظر رکھا جائے اور نکاح کے معاملہ میں اسی کے مطابق عمل کیا جائے۔

یہ نمبروار چھ چیزیں تھیں جن میں ہمیں مدیر محترم سے اتفاق نہیں تھا، ہم نے علمی طور پر اُن کا اظہار کر دیا ہے، اگر مدیر محترم ہماری آراء سے اتفاق رکھتے ہیں تو سنت اکابر پر عمل کرتے ہوئے اپنا رجوع نامہ شائع کریں، اور اگر ان آراء سے اتفاق نہیں ہے تو علمی طور پر اس کا جواب مرحمت فرمائیں، ہم آپ کی طرف سے جواب کے منتظر رہیں گے۔ ۳۸

معذرت کے ساتھ ایک خادم دین

والسلام

مفتی حفیظ اللہ قاسمی

کوئی جاہل بھی ترغیب نہیں دے سکتا، آپ ہی لا یضع الامور مواضعھا کی غلطی ہر جگہ کر بیٹھتے ہیں، فقہاء نے اگر معروفۃ الحسب والنسب سے نکاح کی ترغیب دی ہے تو یہ مسئلہ بھی تو بتایا ہے کہ بیوی کو اس کی حیثیت کے مطابق نفقہ کسوہ اور سکنیٰ کا انتظام کرنا چاہئے، جب خدام دین کی اتنی گنجائش نہیں اور بہ قول آپ کے بنیادی ضروریات بھی فراہم نہیں کر سکتے تو ایسے گھرانوں کو کیسے نباہ سکیں گے اور جب نہیں نباہ سکیں گے تو آئے دن کے جھگڑے اور اختلافات زندگی کو اجیرن نہیں تو اور کیا کریں گے؟

۳۸ جواب آپ کی تحریر کے ساتھ ساتھ میں نے دیدیا ہے بلکہ اپنا وقت اور دماغ خراب کیا ہے؛ خیر! یہ مباحثہ ختم ہوا اس افسوس پر کہ میں نے خط کا جواب ''اشرف الجرائد'' میں شائع کرنے کے بجائے مکتوب الیہ کو بھیجدیا ہوتا تا کہ ان صفحات کا کسی اچھے کام میں استعمال ہو جاتا۔

ایک گذارش:

اب اخیر میں اس پورے مضمون سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اور اپنے کسی تبصرے سے ناگواری و دل آزاری ہوئی ہو تو اس کی معذرت چاہتے ہوئے ناقدِ فاضل سے عرض کرتا ہوں کہ ماشاء اللہ آپ ذی صلاحیت صاحبِ علم وقلم ہیں، جس مسئلے کی طرف توجہ دلانا آپ کا اصل منشاء ہے، اس مسئلے پر ایجابی انداز سے ایک جامع اور قابلِ عمل مضمون لکھئے، مسئلے کی اہمیت، توجہ کی ضرورت، ممکنہ اسباب کی نشان دہی، ذمہ داروں کے اعذار کا حل اور کوتاہیوں کے مواقع وغیرہ امور پر روشنی ڈالیئے، انشاء اللہ اس سے بہت نفع ہوگا اور اس مہم کے آگے بڑھانے میں یہ عاجز آپ کے ساتھ ہے۔

والسلام

درسِ قرآن

پردے اُٹھے ہوئے ہیں اُن کی اِدھر نظر بھی ہے

مولانا عبدالقادر فرید قاسمی*

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا ط (سورۃ التحریم:۸)

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ سے سچی توبہ کرو۔

تشریح: ''توبہ'' کا معنیٰ ہے رجوع الی اللہ یعنی خدا کی طرف لوٹنا اور اپنے گناہوں پر نادم وشرمندہ ہونا اور آئندہ نہ کرنے کا عزم کرنا، چنانچہ ایک موقعہ پر حضرت معاذ بن جبلؓ نے نبی پاک ﷺ سے توبۃ نصوحا کے بارے میں دریافت کیا: یا رسول اللہ !ما التوبۃ النصوح قال أن یندم العبد علی الذنب الذی اصاب فیعتذر الی اللہ تعالیٰ ثم لا یعود الیہ کما لا یعود اللبن الی الضرع (روح المعانی:۱۵/۲۳۴) اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ بندہ اپنے کئے ہوئے گناہوں پر شرمندہ ہوجائے پھر اللہ سے معافی مانگ لے اپنے جرموں کا اقرار کرلے، پھر اس گناہ کی طرف دوبارہ نہ لوٹے جیسے کہ دودھ تھنوں میں واپس نہیں جاسکتا۔

علامہ آلوسیؒ نے مذکورہ آیت کے ذیل میں امام نوویؒ کا قول نقل فرمایا کہ توبہ کی قبولیت کے لئے تین باتیں شرط ہیں:۱) ان یقلع عن المعصیۃ یعنی جس گناہ سے وہ توبہ کررہا ہے اُسے بالکلیہ چھوڑ دے، اگر توبہ بھی جاری رہے اور پھر گناہ بھی ہوتا رہے تو یہ توبہ، خود لائقِ توبہ ہوجائے گی۔ ۲) ان یندم علی فعلہ اپنے کئے پر ندامت بھی ہو، اللہ کی بصد عنایتوں کے باوجود اپنی بصد بغاوتوں کا اعتراف بھی ہو، ۳) ان لا یعود الی مثلھا ابداً اس جیسے گناہ کے نہ کرنے کا عزم بالجزم ہو اور پختہ ارادہ ہو کہ کبھی اس جیسا گناہ نہیں کریں گے۔

*استاذ شعبۂ عالمیت ادارہ ہذا

یہ مشاہدہ ہے کہ کپڑا ایک مدت کے استعمال کے بعد بودہ ہوجاتا ہے یا کسی وجہ سے پھٹ جاتا ہے تو اس متاثرہ حصہ کا رفو کروانا پڑتا ہے تب جا کر وہ لائق استعمال ہوتا ہے ایسے ہی بندہ جب گناہ پر گناہ کرتا ہے تو اس کے ایمان میں خلل اور دل میں تاریکی پیدا ہوجاتی ہے جس کی نحوست سے طاعات میں بے رغبتی اور خدا سے بے اعتنائی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے اتنی کہ اگر دستِ غیب اس کی یاوری نہ کرے تو پھر گمراہی بے اندازہ ہوجاتی ہے اور یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ گناہ کی نحوست سے ذہن و دماغ کا انتشار، قلبی بے کیفی، زندگی کی الجھنیں پیدا ہوجاتی ہیں، جس کے سبب انسان بے چینی اور بے کلی میں رہتا ہے، کیونکہ طاعت سے دل کا سکون وسرور اور معصیت سے وحشت واضطراب وابستہ ہے، جس کی وجہ سے زندگی کا چین وسکون ختم ہوجاتا ہے اور اگر اس صورتحال سے آگہی پاکر فوراً بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے، توبہ کر کے اپنے روٹھے رب کو منالیتا ہے، دنیا کے جھمیلوں سے نکل کر اپنے رب کی عافیت وسلامتی میں آجاتا ہے تو اس کو وہ سکون وقرار حاصل ہوتا ہے جو شاہوں کو مسندوں میں، شہزادوں کو محلات میں بھی میسر نہیں آتا، پھر اس کے چہرہ کے تاثرات یوں پڑھے جاسکتے ہیں۔

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی
جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو
ترے عفو بندہ نواز میں

اس پُرفتن دور میں جہاں معاشرہ اسبابِ گناہ کی کثرت سے آلودہ، معصیت زدہ ماحول سے پراگندہ، اور ہر قسم کی برائی سے پُرآشوب ہوچکا ہے، اور جہاں اسلام پر چلنا قدامت پرستی، دین کو تھامنا انتہاء پسندی، اپنے آپ کو مذہبی بنانا بنیاد پرستی سمجھا جارہا ہو، تو ایسے ماحول میں فطوبیٰ للغرباء کے حصول کے لئے دین کی سلامتی اور توبہ واستغفار کا اہتمام اور دعاؤں کا التزام کرنا چاہیئے۔

قطرۂ اشک ندامت در سجود
ہمسری خون شہادت می نمود

دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو وہ آنکھیں عطا فرمائیں جو اس کے خوف سے آنسو بہانے والی ہوں اور اس دل سے نوازے جو اس کی خشیت سے لرزاں وترساں رہتا ہو۔ آمین

درسِ حدیث

علاماتِ نفاق

مولانا سید نذیر احمد یونس قاسمی*

عَنْ عَبْدِ اللهِ بنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ اَرْبَعُ خِصَالٍ مَنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقاً خَالِصاً مَنْ حَدَّثَ كَذِبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا عَاهَدَ غَدَرَ وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ مَنْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتّٰى يَدَعَهَا (رواہ البخاری: ۱/۴۵۱)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چار خصلتیں جس میں ہوں گی وہ خالص منافق ہوگا وہ شخص جو بات کرے تو جھوٹ بولے اور جب وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے اور جب عہد کرے تو توڑ دے اور جب جھگڑا کرے تو گالی دے اور جس میں ان چاروں میں سے کوئی ایک خصلت ہو تو اس میں نفاق کی ایک عادت ہوگی یہاں تک کہ اس کو چھوڑ دے۔

تشریح: خصائلِ حسنہ سے آراستہ ہونا اور صفاتِ سیئہ سے اپنے کو بچانا یہ ایمانی تقاضہ ہے جو نفوس اس تقاضے کو پورا کرتے ہیں ان کا ایمان روز افزوں رہتا ہے، وہ اعمالِ صالحہ میں پختگی اور مداومت پالیتے ہیں، اور اس راہ سے خدا تک پہونچنے کا راستہ ان کے لئے آسان ہوجاتا ہے، رذائل سے دوری ان کے قلوب کو مصفّٰی کردیتی ہے اور عبادت کا نور دل کو مجلّٰی کردیتا ہے پھر مومن ایمان وعرفان کے اعلیٰ منازل ومراتب پر چڑھتا چلا جاتا ہے، اسی لئے احادیثِ مبارکہ میں جگہ جگہ مختلف بُرے اعمال کی قباحت وشناعت بیان کی گئی اور اعمال حسنہ کی ترغیب دی گئی ہے۔

مذکورہ روایت میں بھی وہ چار اعمال ذکر کئے گئے ہیں جن کا مرتکب کھرے اور خالص ایمان سے محروم اور عملی منافقین کے زمرہ میں شامل ہوجاتا ہے پہلی بُری عادت یہ ہے کہ بات بات پر جھوٹ بولے اور دروغ گوئی کو اپنی عادت بنالے، یہ انتہائی بُرا عمل ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں جابجا اس کی مذمت منقول ہے اور آخرت میں اس عمل پر ہونے والے شدید عذاب سے ڈرایا اور دھمکایا گیا ہے۔

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

بخاری شریف کی روایت ہے حضرت سمرہ بن جندبؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا آج رات میں نے دو شخصوں کو دیکھا جو میرے پاس آئے ان دونوں نے میرا ہاتھ پکڑا پھر وہ مجھے مقدس سرزمین کی طرف لے گئے تو دیکھا کہ وہاں ایک شخص بیٹھا ہے اور ایک دوسرا شخص کھڑا ہے جس کے ہاتھ میں لوہے کا آنکڑا ہے جسے اس آدمی کی کلّے میں ڈالتا ہے یہاں تک کہ اس کو گُدّی تک پہنچا دیتا ہے پھر اس کے دوسرے جبڑے کے ساتھ اسی طرح کرتا ہے اور اس کا یہ کلّہ مل جاتا ہے پھر دوبارہ اسی طرح کرتا ہے، میں نے دریافت کیا یہ کیا ہے؟ کہا ایک جھوٹا شخص ہے جو جھوٹی بات کہتا تھا پھر وہ جھوٹی بات نقل کی جاتی تھی یہاں تک کہ ساری دنیا میں پھیل جاتی اس لئے قیامت تک اس کے ساتھ ایسے ہی کیا جاتا رہے گا۔ (بخاری: ۱/ ۱۸۵)

حدیث مبارک میں دوسری بُری عادت یہ بیان کی گئی کہ جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے؛ وعدہ کی پاسداری یہ ایسا عمل ہے کہ ہر شریف آدمی اس کو ضروری سمجھتا ہے اور وعدہ خلافی کو رذیل حرکت قرار دیا جاتا ہے، وعدہ چاہے دینی ہو یا دنیوی اس کا پورا کرنا لازمی اور ضروری ہے؛ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا خصوصی وصف قرآن نے بیان کیا کہ انہ کان صادق الوعد کہ وہ وعدہ کے سچے تھے، قدوتنا جناب محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل بھی بتلاتا ہے کہ آپ نے وعدہ کرنے کے بعد تین دن تک اسی مقام پر ٹھہر کر انتظار کیا، تاکہ وعدہ کی خلاف ورزی نہ ہو۔

تیسری خصلت یہ بتلائی گئی کہ جب معاہدہ کرے تو دھوکہ دہی کرے، دھوکہ دہی انسان کو بے اعتبار بنا دیتی ہے، معاشرہ و ماحول میں ایسا شخص بُری نظر سے دیکھا جاتا ہے، اور اس عمل کا نتیجہ میں جس طرح آدمی دنیا میں بے وقعت ہو جاتا ہے ایسے ہی آخرت میں بھی ذلیل وخوار ہوگا۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہر عہد شکنی کرنے والے کیلئے قیامت کے دن ایک جھنڈا ہوگا جو ہر شخص کو قیامت کے دن نظر آئے گا اور وہ اس کے ذریعہ پہچان لیا جائے گا (بخاری: ص: ۴۵۲) شارحینِ حدیث بیان کرتے ہیں جیسی عہد شکنی ہوگی اسی مقدار کا جھنڈا ہوگا اور میدانِ حشر میں یہ شخص اسی طرح رُسوا کیا جائے گا۔

اور چوتھی بات یہ بتلائی کہ جب بھی جھگڑا کرے تو گالی دے، انسان کے مزاج مختلف ہیں اور ان کے معاملات ان گنت ہیں ایسے میں کسی اختلاف کا پیدا ہونا ممکن ہے لیکن اسلام اپنے متبعین کو جدال وقتال سے بچاتا ہے اور ایسے موقع پر آپے سے باہر ہو کر بیہودہ بکنے، گالی گلوچ کرنے سے منع کرتا ہے اور یہ حکم دیتا ہے کہ اپنے معاملہ کو باہمی صلح کے ذریعہ حل کرلو اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے واضح انداز میں فرمایا سباب المومن فسوق وقتالہ کفر کہ مومن کو گالی دینا بڑا گناہ ہے اور قتل کرنا کفر ہے۔

اس روایت کے آخری حصہ میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمارہے ہیں کہ جس کسی میں ان میں سے کوئی خصلت ہوگی

تو اس میں نفاق کی خصلت ہوگی اور نفاق کے جراثیم ایمانی قوت کو کم اور روحانی طور پر مومن کو کمزور کر دیتے ہیں۔ اس لئے علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں تشبیہ مقصود ہے کہ جس میں یہ صفتیں ہوں گی اس کو منافقین کے ساتھ مشابہت ہو جائے گی۔ (مرقاۃ المفاتیح: ۱/ ۱۰۸)

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مومن اب حقیقی منافق ہو جائے گا بلکہ وہ عملی منافق ہوگا اس لئے کہ اس روایت کے آخری جملہ سے اشارہ ملتا ہے کہ حتیٰ یدعھا (یہاں تک کہ وہ ان بری عادتوں کو چھوڑ دے) اگر وہ حقیقی منافق ہو جاتا تو اسے تجدید ایمان کا حکم دیا جاتا؛ الغرض مذکورہ روایت کا سبق یہی ہے کہ اپنے کو ایمانی صفات سے آراستہ کیا جائے اور نفاق کے جراثیم سے ایمان کو رکھا جائے کیا جائے اس لئے کہ طاعت نور ہے اور معصیت ظلمت ہے اور نور و ظلمت کا اجتماع ممکن نہیں، ظلمت جب بڑھتی ہے تو وہ طاعت کے نور کو بجھا دیتی ہے۔

اللہ توفیق دے کہ ہم نور ایمانی کی قدر کریں۔ آمین

اپیل برائے دعائے مغفرت

ہر کسی نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے، کسی کو اس دارِ فانی میں قرار نہیں، لیکن کچھ نفوس اپنی زندگیوں کو دعائے ابراھیمی واجعلنی لسان صدق فی الاٰخرین کا مصداق بنا کر وارثین کے لئے تابندہ نقوشِ راہ چھوڑ جاتے ہیں؛ گذشتہ دنوں ایسی ہی چند ستودہ صفات شخصیات راہیٔ آخرت ہوئیں، جن میں (۱) حضرت مولانا نظام الدین صاحبؒ (امیر شریعت بہار، جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ و رکن شوریٰ دار العلوم دیوبند و دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو)۔ (۲) شہر کے معروف مدرسہ ''دار العلوم حیدرآباد'' کے استاذ و مفتی صفابیت المال مولانا مفتی عبد المعبود صاحبؒ۔ اور (۳) ریاست کرناٹک کے معزز مؤقر عالم دین، مولانا ابوالحسن علی ندوی اسلامک اکیڈمی کے بانی و جنرل سکریٹری حضرت مولانا محمد الیاس صاحب جاکٹی ندوی بھٹکلی کی والدہ ماجدہ؛ ہیں

ہم ان سب کے حق میں دست بہ دعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی جملہ حسنات کو شرف قبول نصیب فرمائے، اور فروگذاشتوں سے چشم پوشی فرما کر مغفرت و رضوان کی چادر میں ڈھانپ لے اور بلند رُتبے عطا فرمائے۔ متعلقین و محبین اور لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین۔ قارئین سے بھی خواہش ہے کہ ان کے لئے دعائے مغفرت و ایصالِ ثواب فرمائیں۔

گوشۂ خواتین

تسبیحاتِ فاطمہؓ کا اہتمام کیجئے

مفتی محمد احمد علی قاسمی*

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس امت پر احسانات وانعامات میں ایک اہم ترین احسان وانعام آپ سے منقول ''اذکار ودعوات'' ہیں؛ ذکر ودعاء یہ دونوں چیزیں اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان ربط وتعلق کا ذریعہ ہیں، چنانچہ خاص مواقع اور حالات میں پڑھنے کی دعاؤں اور اذکار میں برکت ورحمت کا باعث بننے والا ایک خاص ذکر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی محبوب ترین صاحبزدای حضرت فاطمہؓ کو ایک خاص موقعہ سے تعلیم فرمایا تھا؛ جس کو احادیثِ مبارکہ میں ''تسبیحاتِ فاطمہؓ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ ذکر امت کے تمام افراد بالخصوص خواتینِ اسلام کے لئے بیش بہا نصیحت اور قیمتی اثاثہ ہے۔

حضرت علیؓ بیان فرماتے ہیں: کہ ایک مرتبہ حضرت فاطمہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور چکی پیسنے کے نشانات جو اُن کے ہاتھوں میں تھے انھیں دکھا کر اپنی تکلیف ظاہر کرنے کا ارادہ کیا (مقصد یہ تھا کہ کوئی غلام یا باندی مل جائے) جبکہ حضرت فاطمہؓ نے یہ سُنا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کچھ غلام آئے ہوئے ہیں، حضرت سیدہ فاطمہؓ جب ابا جان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر پہونچیں تو وہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم موجود نہ تھے؛ لہذا ملاقات نہ ہوسکی جس کی وجہ سے اپنی درخواست حضرت عائشہؓ سے کہہ کر آگئیں، جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ نے عرض کردیا کہ حضرت فاطمہؓ آئی تھیں اور یہ کہہ کر گئیں ہیں (کہ مجھے چکی پیسنے کی وجہ سے تکلیف ہے اگر خدمت کے لئے کوئی غلام باندی مل جائے تو محنت کے کام سے نجات ملے) حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ: یہ سُن کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات کو ہمارے پاس تشریف لائے، اُس وقت ہم دونوں سونے کے لئے لیٹ چکے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھ کر احتراماً اٹھنے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم دونوں اپنی اپنی جگہ پر رہو، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے قریب تشریف لائے، میرے اور حضرت فاطمہؓ کے درمیان تشریف فرما ہوئے اور اتنے قریب مل کر بیٹھ گئے کہ مبارک قدم کی ٹھنڈک مجھے اپنے پیٹ پر محسوس ہوئی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ کیا میں تم دونوں کو اس سے بہتر چیز نہ بتاؤں جو تم نے مجھ سے سوال کیا ہے؟ تم ایسا کیا کرو کہ رات کو سونے

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

کے لئے لیٹو تو ۳۳/مرتبہ سبحان اللہ، ۳۳/مرتبہ الحمدللہ، اور ۳۴/دفعہ اللہ اکبر کہہ لیا کرو، یہ تمہارے لئے خادم سے بہتر ہے۔ (مشکوٰۃ شریف)

خواتین اسلام کے لئے حدیثِ مبارکہ میں ایک تو اہم ترین سبق گھریلو کاروبار سے دلچسپی رکھنا ہے، حضرت فاطمہؓ دو جہاں کے سردار کی بیٹی اور جنتی عورتوں کی سردار ہونے کا شرف رکھنے کا باوجود خود ہی چکی پیستی، پانی کا مشکیزہ بھر کر لاتیں، اپنے گھر میں خود ہی جھاڑو دیتیں، خود ہی آگ جلاتیں، الغرض گھر کے سارے کام کاج خود اپنے مبارک ہاتھوں سے انجام دیتی تھیں، جو عورتیں گھر کے کام کاج کو عیب اور اپنی جھوٹی شان کے خلاف سمجھتی ہیں جس کی وجہ سے گھر میں اختلافات اور نااتفاقیاں ہو رہی ہیں اُنھیں حضرت فاطمہؓ سے سبق لینا چاہیئے، اور گھر کے کاموں کو شوق و رغبت کے ساتھ اور کارِ ثواب خیال کر کے انجام دینا چاہیئے؛ جس سے راحت و سکون اور آپسی اتحاد و اتفاق بھی نصیب ہوگا اور اجر و ثواب کا ذریعہ بھی ہوگا، بہت سے گھروں میں عورتیں خود کام کرنے سے جی چُراتی ہیں تو اِس وجہ سے نوکر چاکر رکھنے پڑتے ہیں، جس کے دینی و دنیوی سنگین نقصانات سامنے آرہے ہیں؛ اللہ حفاظت فرمائے۔ آمین

حدیثِ مبارکہ میں خواتینِ امت کے لئے دوسرا بڑا سبق جو دراصل اِس حدیث کی روح اور اس کا مغز ہے وہ ''تسبیحاتِ فاطمہ'' کا اہتمام رکھنا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اِن تسبیحات کو ہر خدمت گار کا بدل قرار دیا اور تمام تر مشقتوں اور محنتوں سے نجات کا ذریعہ فرمایا، حقیقت یہ ہے کہ جو عورت بھی گھر گرہستی کے کام اور بال بچوں کی دیکھ بھال میں محنت و مشقت پائے تو اِس حالت میں ''تسبیحاتِ فاطمہؓ'' کا اہتمام ان شاء اللہ ضرور اِس کے لئے آرام و راحت کا ذریعہ ہوگا، ماضی قریب کے بہت بڑے عالم حضرت مولانا عاشق الٰہیؒ فرماتے ہیں:

فرض نماز کے بعد اور سوتے وقت ان تسبیحات کو پابندی سے پڑھنا چاہئے، بزرگوں نے بتایا ہے اور تجربہ کیا ہے کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خادم دینے کے بجائے سوتے وقت ان تسبیحات کے پڑھنے کا حکم دیا تھا اِس لئے سوتے وقت ان کے پڑھنے سے ایک طرح کی قوت حاصل ہوتی ہے اور دن بھر کی تھکن محنت اور کام کاج کی تھکن دور ہو جاتی ہے، حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جب سے میں یہ وظیفہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنے کبھی اس کو ترک نہیں کیا۔ (تحفۂ خواتین: ۳۴۰)

بہر حال یہ ''تسبیحاتِ فاطمی'' امت کے لئے ایک عظیم روحانی نعمت ہے، اگر کوئی عورت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سچی باتوں پر مکمل ایمان و یقین کی کیفیت کے ساتھ اس ذکر کا اہتمام کرے تو ضرور اُسے نفع ہوگا، اس سے دنیوی فائدہ (یعنی جسمانی تھکن و تعب سے نجات) کے ساتھ ساتھ اور دینی فائدہ (یعنی ذکر اللہ کا اہتمام) بھی حاصل ہوگا؛ ذکر اللہ ایسی انمول نعمت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دفعہ خاص طور پر عورتوں کو خطاب کر کے

فرمایا: تم تسبیح (سبحان اللہ) تہلیل (لا الہ الا اللہ) اور تقدیس (اللہ کی پاکی بیان کرنے) کی پابندی رکھو اور انگلیوں پر پڑھا کرو کیوں کہ اُن سے دریافت کیا جائے گا، ان کو بولنے کی قدرت دی جائے گی اور تم ذکر اللہ سے غافل نہ ہو جاؤ اور نہ رحمت سے بھلا دی جاؤ گی۔ (ترمذی شریف) قیامت کے روز انسان کے اعضائے بدن اس کے اچھے بُرے اعمال کی خبر دیں گے؛ اِس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیثِ مذکور میں عورتوں کو نصیحت فرمائی کہ اللہ کا ذکر کرتے وقت انگلیوں پر شمار کیا کرو؛ تاکہ روز قیامت جب انگلیوں کو بولنے کی طاقت دی جائے اور اُن سے سوال کیا جائے تو یہ انگلیاں ذکر کرنے والوں کے حق میں گواہی دے سکیں، دوسری بات تنبیہ کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمائی کہ ذکر اللہ سے غفلت و بے خبری اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محرومی کا ذریعہ ہے، پھر یہ کہ اِن تسبیحات میں جو تین کلمے ہیں (یعنی سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر) یہ بڑے ہی بابرکت ہیں، اس کے پڑھنے پر بڑے اجر وثواب کا وعدہ بھی ہے؛ حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: الحمد للہ کا کلمہ ترازو کو (ثواب سے) بھر دے گا اور سبحان اللہ اور الحمد للہ کے کلمات (کا ثواب) آسمان وزمین کے درمیان فضاء کو بھر دیتے ہیں۔ (مسلم شریف)

اور یہی وہ کلمات ہیں جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آخرِ زندگی میں دیا، سورۂ نصر میں ہے کہ آپ اپنے رب کی تسبیح وتحمید کے جئے اور اس سے مغفرت کی درخواست کیجئے، وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے (سورۂ نصر) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس سورہ کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کوئی نماز پڑھتے تو یہ دعا کرتے تھے ''سُبْحَانَکَ رَبَّنَا وَبِحَمْدِکَ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ'' (بخاری) حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ اِس سورت کے نزول کے بعد اٹھتے بیٹھتے اور جاتے آتے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ دعا پڑھا کرتے تھے، سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ وَاَتُوْبُ اِلَیْہِ اور فرماتے تھے کہ مجھے اس کا حکم دیا گیا (معارف القرآن: ۸/ ۸۳)

یہ اور اس کے علاوہ کئی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احایث میں ان کلمات سے ذکر کرنے کا حکم دیا ہے، اِس ذکر کا اہتمام ہمارے لئے دنیا وآخرت میں سعادت وکامیابی کا ذریعہ ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق نصیب فرمائے۔ آمین

اصلاحِ معاشرہ

ماہ صفر میں رائج توہمات ورسومات

مولانا عبدالرشید طلحہ نعمانی قاسمی*

دین اسلام ایک نہایت ستھرا اور پاکیزہ مذہب ہے، اور یہی وہ فطری دین ہے جو قیامت تک کے تمام مسلمانوں کیلئے ایک جامع دستور العمل اور مکمل ضابطۂ حیات کی حیثیت رکھتا ہے؛ اسکے احکام، آفتاب نیم روز سے زیادہ روشن اور ماہتاب شب افروز سے زیادہ واضح ہیں؛ اسکی تعلیمات نہایت عمدہ، صاف اور صلاح و فلاح کی ضامن ہیں، شریعت مطہرہ میں مسلمانوں کیلئے زندگی کے تمام شعبہ جات ـــــ خواہ وہ معاملات ہوں کہ عبادات، معیشت ہو کہ معاشرت پھر انکا تعلق انفرادی زندگی سے ہو یا اجتماعی احوال سے غرضیکہ ہر گوشہ حیات ـــــ میں واضح ہدایات اور مفصل احکام موجود ہیں۔

بنیادی طور پر دین اسلام دو چیزوں سے مرکب ہے (۱) عقیدہ (۲) عمل۔ اور یہ بات بھی طئے ہے کہ وہ صحیح عقیدہ اور عمل ہی اللہ کی بارگاہ میں مقبول و معتبر ہے جس کی شریعت نے تعلیم دی ہے اور اس عقیدہ و عمل کا کوئی اعتبار نہیں جو کلی یا جزئی طور پر دین اسلام کی تعلیمات کے مغائر و مخالف ہے۔ ارشاد باری ہے وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾ (سورۃ آل عمران) یعنی جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کو چاہے گا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔

موجودہ دور میں اسلامی تعلیمات سے دوری اور بے رغبتی عام ہوتی جارہی ہے؛ جسکا لازمی نتیجہ عقیدہ و عمل میں خرابی اور بگاڑ کی شکل میں رونما ہو رہا ہے اور اسی کا ایک حصہ بدشگونی، توہم پرستی اور خود ساختہ فاسد خیالات اور عقائد ہیں، اس سلسلہ میں بعض مروجہ اعمال و افکار اور رسوم و رواج لوگوں کے دلوں میں اس قدر رچ بس گئے ہیں کہ اگر اس طرح اللہ سبحانہ وتعالی کی ذات پر توکل اور اسکی قدرت کا یقین اور تقدیر پر ایمان دلوں میں راسخ ہو جائے تو دارین کی سعادت مندی نصیب ہو جائے؛ من جملہ ان فاسد عقائد کے کچھ وہ جاہلانہ نظریات بھی ہیں جو ماہ صفر سے متعلق معاشرہ میں پھیلے ہوتے ہیں۔

*استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

صفر اسلامی کیلنڈر کا دوسرا مہینہ ہے جس کے بارے میں لوگوں کے درمیان بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں؛ جہاں ایک طرف اس کے ساتھ بہت سی توہمات اور بدشگونیاں وابستہ کرلی گئی ہیں، وہیں دوسری طرف ان کے خودساختہ حل بھی تلاش کرلئے گئے ہیں، صفر کا مہینہ اسلام سے پہلے بھی منحوس سمجھا جاتا تھا لیکن اسلام نے نیک فالی کے طور پر اسے صفر الخیر یا صفر المظفر (کامیابی کا مہینہ) کا نام دیا۔

صفر کے معنیٰ اور وجہ تسمیہ:

عربوں کے ہاں چار مہینے حرمت کے تھے ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب، ان مہینوں میں وہ ہر قسم کے جنگ وجدل سے باز رہتے اور اس انتظار میں ہوتے کہ جیسے ہی یہ حرمت والے مہینے ختم ہوں تو وہ لوٹ مار کا بازار گرم کریں؛ لہٰذا صفر شروع ہوتے ہی وہ قتل وغارت گری، لوٹ مار و رہزنی اور جنگ وجدل کے ارادے سے گھروں سے نکلتے تو ان کے گھر خالی ہوجاتے اس طرح عربی میں یہ محاورہ "صفر المکان" (گھر کا خالی ہونا) مشہور ہوگیا چنانچہ معروف محدث اور تاریخ داں علامہ سخاویؒ نے اپنی کتاب "المشہور فی اسماء الایام والشھور" میں صفر کے مہینے کی یہی وجہ تسمیہ لکھی ہے، نیز صفر کو صفر اسلئے بھی کہتے ہیں کہ لگاتار حرمت والے مہینے گزرنے کے بعد باشندگان مکہ جب سفر کرتے تھے تو سارا مکہ خالی ہوجاتا تھا۔ (ابن منظور کی کتاب لسان العرب ج ۴/ص ۴۶۲، ۴۶۳)

ماہ صفر میں رائج بدعات:

(۱) ماہ صفر اور خصوصا اسکے ابتدائی تیرہ دن ـــــ جنہیں لوگوں نے تیرہ تیزی سے موسوم کیا ـــــ کو منحوس جانتے ہیں اور ان میں آفات وبلیات اور مصیبتوں کے نازل ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں حتی کہ بعضوں نے سینکڑوں کی تعداد میں آفات وبلیات کے نزول کی اور ماہ صفر کے منحوس ہونے کی بے اصل اور من گھڑت راویات بھی نقل کرلی ہیں۔ (۲) اس ماہ میں رشتے اور شادیاں نہیں کی جاتیں بلکہ جن کی شادی ہوچکی ہوتی ہے ابتداء میں ان شوہر اور بیوی کو تیرہ دن تک جدا رکھا جاتا ہے اس نظریہ سے کے ان ایام میں ان کا تعلق آپس میں کشیدگیوں اور نزاع کا باعث ہوگا۔ (۳) اس ماہ میں سفر نہیں کیا جاتا اور کسی نئے کام کا آغاز مثلاً دکان یا مکان کی افتتاح وغیرہ نہیں کی جاتی؛ اس بنا پر کہ اس ماہ کی نحوست کی وجہ سے یہ سب کام باعث خیر نہ ہونگے۔ (۴) تیرہویں تاریخ کی صبح کو تیرہ تیزی کی مخصوص خیرات، آفات وبلیات سے حفاظت کیلئے بطور صدقہ فقراء میں تقسیم کردی جاتی ہے۔ (۵) ماہ صفر کے آخری چہار شنبہ کو سیر وتفریح کے لئے نکلتے ہیں جسکا نظریہ یہ ہے کہ اس روز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل صحت فرمایا تھا اور تفریح فرمائی تھی یہ تمام کے تمام جاہلانہ نظریات اور بے حقیقت چیزیں ہیں شریعت میں ان کی کوئی اصل نہیں اگر ماہ صفر میں نحوست ہوتی یا یہ آفات وبلیات کا مہینہ ہوتا تو شریعت میں

اس کا ضرور تذکرہ بھی ہوتا اور اس سے حفاظت کے طریقے بھی بتائے جاتے لیکن قرآن وحدیث میں کہیں ایسا منقول نہیں ہے؛ بلکہ صحاح ستہ ودیگر کتب حدیث کی بیسیوں روایات سے یہ ثابت ہے کہ ماہ صفر میں قطعا کوئی نحوست نہیں؛ دین اسلام نے کبھی کسی مہینہ اور کسی دن کو منحوس قرار نہیں دیا، لھذا کوئی وقت برکت والا اور عظمت و فضیلت والا تو ہوسکتا ہے جیسے ماہ محرم، ماہ رمضان، سال کے متبرک شب وروز اور جمعہ کی ساعت اجابت (قبولیت کی گھڑی) وغیرہ؛ لیکن نحوست والا قطعی نہیں ہوسکتا، اور ماہ صفر میں انجام دیئے جانے والے یہ تمام امور اور اس سے متعلق جملہ نظریات خود ساختہ ہیں، اب رہا آخری چہار شنبہ سے متعلق نظریہ سو اس کا جواب یہ ہے کہ تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ اس روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحت یاب نہیں ہوئے بلکہ مرض الموت ـــــ جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ۱۳ دن تک بیمار رہے اس بیماری ـــــ کی ابتداء اس دن سے یعنی ماہ صفر کے آخری چہار شنبہ سے ہوئی جو بڑھتی ہی گئی یہاں تک کہ آپ کا وصال ہوگیا۔

اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ۲۸/صفر کو چہار شنبہ (بدھ) کے روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض میں زیادتی ہوئی تھی اور یہ دن ماہِ صفر کا آخری چہار شنبہ تھا، یہ دن مسلمانوں کے لیے تو خوشی کا ہے ہی نہیں؛ البتہ یہود وغیرہ کے لیے شادمانی کا دن ہوسکتا ہے، اس روز کو تہوار کا دن ٹھہرانا، خوشیاں منانا، اور مخصوص کھانا بنا وغیرہ، یہ تمام باتیں خلافِ شرع اور ناجائز ہیں"۔ (فتاویٰ حقانیہ، کتاب البدعۃ والرسوم: 2/84، جامعہ دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک، وکذا فی فتاویٰ رحیمیہ، ماتعلق بالسنۃ والبدعۃ: 2/68، 69، دارالاشاعت)

ماہ صفر کو منحوس سمجھنے کی تردید:

اس مہینے کے تعلق سے لوگوں میں جو مذکورہ رسومات وبدعات رواج پاچکی ہیں ان کی تردید نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جابہ جا متعدد احادیث میں فرمائی ہے:

(۱) لاعَدْوٰی وَلَا طِیرَۃَ وَلَا ھَامَّۃَ وَلَا صَفَرَ (رواہ البخاری: رقم ۵۷۰۷) (اللہ کی مشیت کے بغیر) کوئی بیماری متعدی نہیں اور نہ ہی بدشگونی لینا جائز ہے، نہ اُلو کی نحوست یا روح کی پکار اور نہ ماہِ صفر کی نحوست۔

نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ اقدس ہے: (۲) **الطِّیَرَۃُ شِرْكٌ، الطِّیَرَۃُ شِرْكٌ** (رواہ ابوداؤد، رقم ۳۹۱۲) کسی چیز کو منحوس خیال کرنا شرک ہے، کسی چیز کو منحوس خیال کرنا شرک ہے۔

سنن ابوداؤد کی اس روایت کا مطلب یہ ہے کہ: جاہلیت میں لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ بدشگونی (کسی چیز کو منحوس سمجھنا) نفع لاتی ہے یا نقصان دور کرتی ہے چنانچہ جب اُنھوں نے اسی اعتقاد کے مطابق عمل کیا تو گویا اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرکِ خفی کا ارتکاب کیا۔

(۳) دوسرے مقام پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مَنْ رَدَّتْهُ الطِّيَرَةُ مِنْ حَاجَةٍ فَقَدْ أَشْرَكَ (رواہ احمد فی مسندہ رقم ۷۰۴۵) جو شخص بدشگونی کے ڈر کی وجہ سے اپنے کسی کام سے رک گیا یقیناً اس نے شرک (اصغر) کا ارتکاب کیا۔

الغرض: ماہ وسال، شب وروز اور وقت کے ایک ایک لمحے کا خالق اللہ ربّ العزت ہے، اللہ تعالیٰ نے کسی دن، مہینے یا گھڑی کو منحوس قرار نہیں دیا؛ بلکہ قرآن مجید میں اس کا صاف اعلان فرمادیا: مَا أَصَابَ مِن مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِّن قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَا (سورۃ الحدید ۲۲) کوئی مصیبت نہ زمین پر پہنچتی ہے اور نہ تمہاری جانوں پر مگر وہ ایک کتاب میں ہے، اس سے پہلے کہ ہم اسے پیدا کریں۔ لہٰذا، ایسے جاہلانہ خیالات جو غیر مسلم اقوام اور قبل از اسلام مشرکین کے ذریعے مسلمانوں میں داخل ہوئے ہیں ان سے بچنا از حد ضروری ہے، آج یہی فاسد نظریات مسلم اقوام میں بھی دَر آئے ہیں، اس لیے ماہ صفر بالخصوص اس کی ابتدائی تاریخوں کو منحوس سمجھنا سب جہالت کی باتیں ہیں، دین اسلام کے روشن صفحات ایسے توہمات سے پاک ہیں، کسی وقت کو منحوس سمجھنے کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں بلکہ کسی دن یا کسی مہینہ کو منحوس کہنا درحقیقت اللہ ربّ العزت کے بنائے ہوئے زمانہ میں، جو شب وروز پر مشتمل ہے، نقص اور عیب لگانے کے مترادف ہے اور اس چیز سے نبی ﷺ نے ان الفاظ میں روک دیا ہے: قَالَ اللهُ تَعَالىٰ: يُؤْذِينِي ابْنُ آدَمَ يَسُبُّ الدَّهرَ وَأَنَا الدَّهْرُ، بِيَدِيَ الْأَمْرُ، أُقَلِّبُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ (رواہ البخاری: ۷۴۹۱)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ابن آدم مجھے تکلیف دیتا ہے، وہ وقت (دن، مہینے، سال) کو گالی دیتا ہے؛ حالاں کہ وقت (زمانہ) میں ہوں، بادشاہت میرے ہاتھ میں ہے، میں ہی دن اور رات کو بدلتا ہوں۔

معلوم یہ ہوا کہ دن رات اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں، کسی کو عیب دار ٹھہرانا درحقیقت خالق ومالک کی کاری گری میں عیب نکالنا ہے۔

نحوست کی تردید کرنے والے، بغیر حساب وکتاب جنت میں:

اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے والے لوگوں کے بارے میں رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: مجھے میری اُمت کے بارے میں بتایا گیا کہ یہ آپ کی اُمت ہے، ان میں ستر ہزار ایسے ہیں جو پہلے جنت میں جائیں گے، ان پر کوئی حساب اور عذاب نہیں ہوگا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: میں نے پوچھا کہ یہ کس وجہ سے بغیر حساب اور عذاب کے جنت میں جائیں گے؟ تو جبریل نے جواب دیا: كَانُوا لَا يَكْتَوُونَ وَلَا يَسْتَرْقُونَ وَلَا يَتَطَيَّرُونَ وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ (رواہ البخاری: رقم ۶۵۴۱) (اُن کی صفت یہ ہے کہ) وہ اپنے جسم کو داغتے نہیں، نہ ہی دم کرواتے ہیں، نہ کسی چیز کو منحوس سمجھتے اور وہ اپنے ربّ پر توکل کرتے تھے۔

مندرجہ بالا حدیث میں بلا حساب جنت میں جانے والے لوگوں کے اوصاف کا ذکر ہے، ان میں ایک خوبی یہ ہے کہ وہ کسی چیز کو منحوس نہیں سمجھتے اور ان میں توکل کا مادہ بدرجہ اتم موجود ہے۔

اسی طرح ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے توکل کے بارے فرمایا: اگر کسی مسلمان کو کوئی ایسی چیز پیش آجائے جس سے خواہ مخواہ ذہن میں بدخیالی اور بدفالی کا تصور آتا ہو تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ دعا سکھلائی :اَللّٰھُمَّ لَا یَاتِیْ بِالْحَسَنَاتِ إِلَّا أَنْتَ وَلَا یَدفَعُ بِالسَّیِئَاتِ إِلَّا أَنْتَ وَلَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ إِلَّا بِاللّٰہِ (أبوداؤد: ۸۹۱۹۳) اے اللہ! اچھائیوں کو تیرے سوا کوئی نہیں لاتا اور بری چیزوں کو تیرے سوا کوئی دور نہیں کرتا اور گناہ سے بچنے اور نیکی کرنے کی طاقت صرف اللہ ہی سے ملتی ہے۔

سعادت ونحوست کا معیار!!

حقیقت یہ ہے کہ نحوست اور سعادت کا معیار انسان کا اپنا عمل ہے، ہر وہ نیک عمل جو خالص اللہ کی رضا کے لئے کیا گیا ہو چاہے وہ سال کے کسی مہینے اور مہینے کے کسی روز وشب میں ہو، وہ مہینہ اور وہ زمانہ باسعادت ہے اسی طرح ہر برا عمل جسے انسان نے اپنی زندگی کے کسی بھی وقت انجام دیا ہو وہ وقت اس کے لیے نحوست کا باعث ہے، بالفاظِ دیگر دین وشریعت کے احکامات وتعلیمات پر عمل کرنے کے لئے جدوجہد کرنے، اللہ اور رسول کی بتائی ہوئی باتوں اور سنتوں کا اہتمام والتزام کرنے نیز اوامر کے امتثال ونواہی سے اجتناب کی سعی کرنے میں جو وقت گذرتا ہے وہ وقت انسان کی نیک بختی وسعادت مندی، فلاح وظفر مندی اور فوز وکامرانی کا سبب بنتا ہے جو ہر مردِ مومن کے لئے اس کے ایمان کی تروتازگی اور نشوونما کا باعث ہے، اس کے برعکس خلافِ شریعت، ترکِ سنت، اور ارتکاب معصیت کی وجہ سے انسان پر غیر شعوری طریقے سے جو منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ اسکی زندگی میں قباحتوں اور نحوستوں کا احساس دلاتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ بعینہ اسی وقت کو منحوس سمجھنے لگتا ہے، الغرض صفر، مظفر ہے صفر باظفر ہے، صفر نے غزوات کے سب سے پہلے غزوہ، غزوۃ الابواء سے اسلام کو کامیابیاں بخشی ہے، صفر نے صحابہ کرام سابقینِ اولین کو جینے کا حوصلہ دیا ہے، ماہِ صفر ۴ سنہ ھجری میں رحمت دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُم المؤمنین حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا سے اور ماہ صفر ۷ سنہ ہجری میں اُم المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا ہے۔

اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم بدشگونی اور بدفالی کے اس عمل کو چھوڑ کر عزم ویقین، خلوص ونیک نیتی اور تقوی وللّٰہیت کے ذریعہ ماہِ صفر میں بلا تأمل ہر وہ عمل کریں جو ہم شبانہ روز اور ماہ وسال کے دوران مختلف مواقع سے کرتے رہتے ہیں۔

تعاقب فرقِ باطلہ

قسط (۱۶)

فتنہ انکارِ حدیث اور اسباب وعلل

مولانا کبیر الدین قاسمی*

شیعہ حضرات کا چوتھا عقیدہ (جس کا تذکرہ قسط (۱۴) میں گذر چکا ہے، یہ ہے کہ ائمہ (معصومین) کو تحلیل وتحریم کا مکمل اختیار حاصل ہے حتیٰ کہ قرآن کریم کے منصوص احکام میں بھی تحلیل وتحریم کا حق حاصل ہے، اس عقیدہ کی وضاحت وصراحت بالفاظِ دیگر اس طرح بھی کی جاسکتی ہے کہ ان کے نزدیک ائمہ کرام کو نسخِ احکام کا حق حاصل ہے؛ جس حلال کو چاہیں نسخ کردیں اور حرام سے بدل دیں اور جس حرام کو چاہیں منسوخ کرکے حلال بنالیں، اسی عقیدہ کی یہ کرشمہ سازی ہے کہ شیعوں کے ہاں اصح قول کے مطابق بیوی سے لواطت (پچھلے راستہ میں شہوت رانی) جائز ہے اور کریلا پر نیم چڑھا یہ کہ نوخیز لڑکوں سے بھی بدفعلی جائز ہے، نیز شوہروں کا اپنی بیویوں کی شرمگاہ کو عاریۃً (بلاعوض انتفاع کے لئے) دینا جائز عمل ہے،[1] (۱) اس قسم کے خرافات کا اثر بد شیعہ عوام پر کیا ظاہر ہوا، بالخصوص ان کے علماء نے ایسے گناہِ کبیرہ کو جائز قرار دے کر کتنا ناجائز فائدہ اٹھایا، ان سب باتوں کے سپردِ قرطاس کرنے کا یہ موقعہ نہیں ہے ورنہ آپ انگشت بدنداں ہوجائیں گے اور ان کے گھناؤنے واقعات کو پڑھ سن کر شیطان بھی شرما جائے گا، مزید طرفہ تماشہ یہ ہے کہ ایسے من گھڑت مسائل کو جھوٹی سند کے ساتھ آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کرتے ہیں، یہ چند سطور بس ان کے چوتھے عقیدہ کے تباہ کن نتائج اور اثراتِ بد کو واضح کرنے کے لئے خامہ فرسائی کی گئی ہے، ورنہ اصل کام تو یہ پرکھنا ہے کہ شیعوں کا مذکورہ عقیدہ کتاب وسنت کی روشنی میں کتنا صحیح اور کتنا غلط ہے۔

لہذا مقصد اصلی کی جانب روئے سخن پھیرا جاتا ہے کہ شیعہ حضرات کا مذکورہ عقیدہ نہ صرف غلط اور باطل ہے بلکہ شرک فی الصفات پر مبنی ہے، شرک کی دو صورتیں ہیں (۱) ایک صورت تو یہ ہے کہ اللہ کی ذات کے مماثل

[1] الاستبصار: ۳/ ۱۳۶، الفروع ۲/ ۲۰۰۔ نوٹ: کشف الاسرار وتبرئۃ الائمۃ الاطہار" مولف سید حسین موسوی نجفی کی کتاب کا اردو ترجمہ ابوکلثوم ہندی نے "مظلوم اہل بیتؓ کا مقدمہ" سے کیا ہے، تفصیلی معلومات کے لئے مطالعہ کریں۔

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

کوئی ذات ثابت اور موجود مان لیا جائے، اس کو شرک فی الذات (اللہ جل شانہ کی ذات میں شریک ٹھہرانا) کہا جاتا ہے؛ اس کا ابطال مختلف آیتوں میں کیا گیا ہے:

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ۝۷۱ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝۷۲

(سورۃ القصص)

(اے پیغمبر ان سے) کہو ذرا یہ بتلاؤ اگر اللہ تم پر ہمیشہ کے لئے قیامت کے دن تک رات مسلط کردے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمہارے پاس روشنی لے کر آئے؟ بھلا کیا تم سنتے نہیں ہو؟ کہو: ذرا یہ بتلاؤ کہ اگر اللہ تم پر دن کو ہمیشہ کے لئے قیامت کے دن تک مسلط کردیں تو اللہ کے سوا کونسا معبود ہے جو تمہیں وہ رات لا کر دیں جس میں تم سکون حاصل کرسکو؟ بھلا کیا تمہیں کچھ سُجھائی نہیں دیتا؟

دوسری صورت یہ ہے کہ وہ افعال واحوال جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں اور صرف اللہ تعالیٰ ہی سے ان کا صدور ہوتا ہے، ایسے افعال واحوال کو غیر اللہ کے لئے ثابت کرنا اور غیر اللہ سے صدور کا اعتقاد رکھنا شرک فی الصفات ہے، یعنی اللہ جل شانہ کی صفت وشان میں غیر اللہ کو شریک وسہیم بنانا اس طرح کہ ان صفات واحوال کے ساتھ غیر اللہ بھی متصف ہو؛ مثال کے طور پر آسمان سے بارش برسانا اللہ جل شانہ کا کارِ عظیم ہے اور اس کی صفت وشان ہے اب اگر کوئی شخص دوسروں کے لئے بارش برسانے کی قوت وقدرت مان لے اور اس کی نسبت دوسروں کی جانب کرنے لگے یا غلہ وانا ج کا زمین سے اُگانا اور اس کو پختہ کرنا صرف اللہ تعالیٰ کی شان ہے، انسان فقط واسطہ اور آلۂ محض ہے، اب اگر کوئی انسان زمین سے غلہ وانا ج اُگانے والا اور اس کی کاشت کرنے والا بلا واسطہ اور بالذات غیر اللہ کو قرار دے اور یہ اعتقاد رکھے کہ اسی نے پیدا کیا ہے تو یہ شرک فی الصفات ہے، جو صفت اور کام اللہ کے ساتھ مختص تھا اس کو غیر اللہ کے حق میں ثابت کردیا، شرک کی اس قسم کا رد اللہ جل جلالہ نے بہت سے آیات شریفہ میں فرمایا ہے جیسے ارشادِ باری ہے:

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط قُلِ اللّٰهُ ط قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ط قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ

(سورۃ الرعد: ۱۶)

(اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے) کہہ دیجئے کہ آسمانوں اور زمینوں کا رب کون ہے (آپ جواب دے دیجئے) کہ اللہ ہے، کہو کہ پھر کیا تم سب نے اللہ کے علاوہ ایسوں کو مددگار بنالیا ہے جو خود کے نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتے ہیں، کہو کہ کیا اندھے اور بینا دونوں برابر ہو سکتے ہیں

اسی طرح کائنات کی بعض موجود چیزوں کو حلال اور بعض کو حرام کرنا اور کچھ استعمال کو جائز ٹھہرانا اور کچھ کے استعمال کو منع کرنا اللہ تعالیٰ کی صفت اور خاصہ ہے، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام صرف ان احکام کے مبلغ اور مُظہر ہیں، اپنی طرف سے کسی چیز کو حلال وحرام کرنے والے نہیں ہیں، چنانچہ اللہ جل شانہ نے مختلف آیاتِ شریفہ میں تحلیل وتحریم کی نسبت واسناد اپنی طرف کی ہے، اور خود کو مُحلل اور محرِم (حلال وحرام کرنے والا) قرار دیا ہے، اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ تحلیل وتحریم اللہ کا خاصہ ہے، ارشاد باری تعالیٰ ملاحظہ فرمائیں:

(۱) اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ

(البقرۃ: ۱۷۳)

یقیناً اللہ جل شانہ) نے تم پر مردہ، خون، سور کا گوشت اور جو غیر اللہ کے لئے نامزد کیا جائے اس کا (کھانا) حرام کیا ہے۔

(۲) وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِىْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ط ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝۱۴۶ (الانعام)

اور یہودیوں پر ہم نے ہر ناخن والے جانور کو حرام کیا اور گائے وبکری کی چربیاں ہم نے ان پر حرام کیا مگر ان دونوں کی پشت اور انتڑیوں سے جو شئی ملی ہوتی ہے یہ ہم نے ان کو ان کی سرکشی کی سزا دی تھی اور واقعی ہم سچے ہیں۔

(۳) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ط اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝۸۷

(المائدۃ)

اے ایمان والو! ان طیب اور پاکیزہ چیزوں کو حرام مت کرو، جن کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے حلال کیا ہے اور حد سے تجاوز مت کرو، اللہ تعالیٰ حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں فرماتا ہے،

ہم ان آیتوں میں غور وفکر کریں تو بآسانی معلوم ہوگا کہ پہلی اور دوسری آیات مبارکہ میں تحریم کی اور تیسری آیتِ شریفہ میں تحلیل کی اسناد اللہ جل شانہ کی طرف ہے اور یہ تمام اسنادِ حقیقی ہیں، مجاز کا امکان نہیں ہے، اس لئے کلامِ عرب کا معمولی شد بد رکھنے والا شخص بھی ان آیاتِ کریمہ پر نظر ڈالے گا تو یہی کہے گا کہ تحلیل وتحریم اللہ تعالیٰ کی صفت اور خاصہ ہے، کسی بندہ کو اپنی طرف سے کسی حلال کو حرام اور کسی حرام کو حلال کر لینے کا حق نہیں ہے، جیسا کہ تیسری آیت کریمہ میں اللہ جل جلالہ نے مومنین کو مخاطب کر کے کہا کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے حلال کردہ چیزوں کو حرام نہ بنائیں۔

اگر اس آیتِ شریفہ کا پس منظر ملحوظ رکھا جائے تو یہ حقیقت اور اُجاگر ہو جائے گی؛ چنانچہ صحیحین میں ام المومنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے:

صنع النبی ﷺ شیئا ترخص فیه وتنزه عنه قوم فبلغ ذٰلک النبی ﷺ فحمد الله واثنیٰ علیه وثم قال وما بال اقوام یتنزهون عن الشیئ أصنعه؟ فوالله انی اعلمهم بالله واشدهم له خشیة

(رواه البخاری برقم: ۷۳۰۱، ومسلم برقم: ۲۳۵۶)

کہ نبی اکرم ﷺ نے کوئی عمل کیا تو کچھ لوگوں نے اس میں رخصت خیال کیا (اور عمل کیا) اور ایک جماعت نے اس سے بیزارگی ظاہر کی، وہ خبر نبی کریم ﷺ کو پہونچی تو اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی پھر فرمایا: لوگوں کا کیا حال ہے کہ ایسی چیزوں سے دوری اختیار کرتے ہیں جس کو میں کرتا ہوں؟ قسم بخدا میں ان سے زیادہ اللہ کی معرفت رکھتا ہوں اور ان سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں۔

یہ واقعہ اور اس جیسے واقعات کے پس منظر میں اللہ جل شانہ نے سورۂ مائدہ کی آیت نمبر ۸۷، ۱۸۸/ نازل فرمائی، اور مومنین کو حلال وپاکیزہ چیزوں کو حرام کر لینے سے روکا، چنانچہ اس آیتِ کریمہ کے ذیل میں محمد بن محمد بن محمود ابو منصور الماتریدی (متوفیٰ ۳۳۳) ارقام فرماتے ہیں واتقوا الله ولا تحرموا ما احل الله لکم، (الذی انتم به مومنون) انه لا یحل ولا یحرم الا هو، ولیس الی من دونه تحلیل وتحریم (تفسیر الماتریدی: ۳/ ۵۷۷) اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اس نے جو چیزیں تمہارے لئے حلال کی ہے ان کو حرام مت بناؤ، وہ اللہ جس پر تم ایمان رکھتے ہو کہ حلال وحرام بس وہی کرتا ہے، اور اس کے سوا دوسروں کو حلال وحرام قرار دینے کا حق نہیں ہے،

ان آیاتِ شریفہ کی تفسیر کرتے ہوئے علاء الدین علی بن محمد بن ابراھیم ابن عمر الشیخ ابو الحسن (المتوفیٰ ۷۴۱) رقم طراز ہیں:

فاعلم الله عز وجل بهذه الآية ان شريعة نبيه ﷺ غير ما عزموا عليه من ترک الطيبات وأنه لا ينبغي ان تجتنب الطيبات المباحات ومعنى لا تحرموا، لاتعتقدوا تحريم الطيبات المباحات، فان من اعتقد تحريم شيئى احله الله فقد كفر

(تفسیر الخازن: ۲/ ۷۲)

اللہ عزوجل نے اس آیتِ شریفہ سے یہ بتادیا کہ اللہ کے نبی ﷺ کی شریعت ترک طیبات (پاکیزہ اور حلال چیزوں کے استعمال کو چھوڑ دینا) کے سوا ہے جن کے نہ برتنے کا تم سب نے پختہ ارادہ کیا ہے، اور یہ بھی بتادیا کہ پاکیزہ اور مباح چیزوں سے اجتناب و پرہیز نامناسب ہے، (آیتِ بالا کے اس جز) لاتحرموا کا مطلب یہ ہے کہ پاکیزہ مباح چیزوں کی تحریم کا اعتقاد نہ رکھو اس لئے کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے اس کے حرام کا جس نے اعتقاد رکھا اس نے کفر کیا، یعنی وہ کافر ہوگیا۔

خلاصہ تحریر یہ برآمد ہوا کہ ''تحلیل وتحریم'' اللہ کی صفت اور خالص اسی کا حق ہے، بندے کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ حلال کے حرام یا حرام کے حلال ہونے کا اعتقاد رکھے (بلکہ یہ اعتقاد رکھنا کفر ہے) یہ بات تو عام انسانوں کی ہے، خاصان خدا اور رسولانِ باری تعالیٰ تک کو تحلیل وتحریم کا حق حاصل نہیں ہے؛ واقعات کی تفصیل میں پڑے بغیر مختصر بات یہ ہے کہ نبی خاتم ﷺ نے اپنی بعض ازواج مطہرات کی رضامندی کو پیش نظر رکھ کر کسی حلال شئی کے استعمال سے اپنے آپ کو روک لیا تھا اور اس پر قسم کھالی تھی، تو اللہ جل شانہ نے اپنے پیغمبر ﷺ کو اس پر متنبہ کیا:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ①

اے نبی ﷺ جو اللہ نے آپ کے لئے حلال کیا ہے، اس سے اپنے آپ کو کیوں روکتے ہیں جب کہ آپ ﷺ اپنی ازواج (مطہرات) کی رضامندی کے طالب ہیں اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔

آیتِ شریفہ کی وضاحت یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے اپنے آپ کو اپنی باندی ماریہ قبطیہ کی قربت سے روک لیا تھا یا شہد پینے سے رک گئے تھے، حالانکہ دونوں چیزیں آپ ﷺ کے لئے حلال اور طیب تھیں اور حلال وطیب چیزوں کے استعمال سے رُکنا فعل مباح ہے، لیکن یہ عمل بعض ازواجِ مطہرات کی طیبِ خاطر

کے لئے تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقامِ رفیع اور علوِشان کی نسبت سے خلافِ اولیٰ تھا پس یہ حقیقتاً کسی حلال شئ کی تحریم نہیں تھی، بلکہ فعل مباح (جائز کام) کے حصول سے امتناع واجتناب تھا، بس اسی پر اللہ جل شانہ نے تادیب لطیف فرمائی، اور فعل مباح سے امتناع کو مجازاً ''لم تحرم ما احل الله'' فرمایا تاکہ اس اسلوبِ بیان سے امتِ محمدیہ کو آگاہ کردیا جائے کہ حلال کو حرام بنالینا اور حرام کو حلال بنالینا جائز نہیں ہے بلکہ اعتقاداً ایسا کرنا کفر وشرک ہے، چنانچہ اس آیتِ کریمہ کی تفسیر واحکام بیان کرتے ہوئے فاضل وھبہ بن مصطفیٰ الزحیلی رقم طراز ہیں:

عاتب الله تعالى نبيه ﷺ على الامتناع من تناول ما احل الله فلا ينبغى لاحد تحريم المباح (التفسیر المنیر: ج:۲۸/۳۱۱)

کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخذ و تناول سے امتناع (رکنے) پر عتاب لطیف فرمایا پس کسی کے لئے مباح کی تحریم مناسب نہیں ہے

علامہ قرطبیؒ نے اسی آیتِ شریفہ کے ذیل میں حضرت زجاجؒ کا قول نقل کیا ہے:

قال الزجاج: ليس لاحد ان يحرم ما احل الله ولم يجعل لنبيه ﷺ ان يحرم الا ما حرم الله عليه (القرطبی:۱۸/۱۸۰)

زجاجؒ نے فرمایا کہ کسی کے لئے حلال کو حرام کرنے کا اختیار نہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو (از خود) حرام کر لینے کا حق نہیں دیا ہے مگر جو اُن پر حرام کیا گیا ہے۔

اس توضیح وتنقیح سے یہ معلوم ہوگیا کہ تحلیل وتحریم کا حق کسی بندگانِ خدا کو حاصل نہیں ہے، حتیٰ کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی حاصل نہیں ہے، بس یہ اللہ تعالیٰ کی صفت اور خالص اسی کا حق تصرف ہے۔۔۔ لہذا کسی بھی فرد بشر کو تحلیل وتحریم کا کلی اختیار دینا اور اس کا اعتقاد رکھنا، شرک فی الصفات ہے؛ اسی لئے یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ شیعوں کا عقیدہ بھی لغو وباطل اور مشرکانہ ہے اور سراسر قرآن وحدیث کے خلاف ہے۔ اللھم احفظنا منہم ومن مکائدھم

آدابِ اسلامی

مسواک کے فضائل وآداب

مفتی شیخ آصف علی قاسمی*

انسان دیگر مخلوقات کے برخلاف مدنی الطبع واقع ہوا ہے یعنی وہ اپنی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل میں دوسروں سے تعلقات رکھنے اور نبھانے کا ضرورتمند بھی ہے اور خواہش مند بھی؛ پھر مزید یہ کہ انسانی برادری سے ہٹ کر اُسے دن بھر میں ایک سے زائد دفعہ بے نیاز خداوند قدوس کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اپنی نیازمندی اور عجز بیانی سے بھی کام لینا ہے، پس اس طرح اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق کی ادائیگی کے لئے انسان کو شریعت نے چند امور فطرت کا پابند کیا تا کہ وہ ظاہری تراش وخراش سے اپنی اس حسنِ خلقت کو باقی رکھ پائے جو ''لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم'' سے عطا ہوئی چنانچہ اُسے دس چیزیں فطرتاً ملیں جن میں ایک مسواک ہے، شریعت میں مسواک کرنا نہ صرف وضو اور غسل میں سنت ہے اور نہ ہی صرف سننِ صلوٰۃ ہے؛ بلکہ وہ ـــــ بقول امام اعظمؒ ـــــ مطلقاً سننِ دین میں سے ہے یعنی تمام دینی امور میں اور ان مواقع میں بھی جہاں منھ سے بُو آنے کا خوف ہو، وہاں مسواک سے منھ کی صفائی سنت ہے۔

مسواک کی شرعی نصوص

متعدد روایات سے مسواک کی اہمیت وافادیت خوب واضح ہوتی ہے؛ چند احادیث مبارکہ ملاحظہ فرمائیں (۱) تمہارے منھ قرآن کے راستے ہیں (جن سے تم قرآن پڑھتے ہو) لہذا اُنھیں مسواک سے خوشبودار رکھو! (۲) دس باتیں انبیاء کی فطرت ہیں ان میں مسواک بھی ہے۔ (۳) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کثرت سے مسواک کا ذکر کرتے تھے کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ قرآن میں مسواک کی فرضیت پر کوئی حکم نازل ہوگا۔ (۴) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بندہ جب مسواک کر کے نماز کے لئے ٹھہرتا ہے تو اس کے پیچھے ایک فرشتہ ٹھہرتا ہے جو اس کی قرأت غور سے سنتا ہے، پھر وہ اس سے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ اپنا منہ اُس کے منہ سے لگا دیتا ہے اور اس طرح اس کا پڑھا ہوا سارا قرآن اُس فرشتے کے پیٹ میں داخل ہو جاتا ہے، لہذا اپنے منہ کو پاک صاف کرو۔ (۵) میرے پاس جبرئیل جب بھی آئے مسواک کرنے کی تاکید کئے یہاں تک

*استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ مسواک مجھ پر یا میری امت پر فرض کر دیا جائے گا۔۔۔اور میں اتنا مسواک کرتا ہوں کہ مجھے اندیشہ ہے کہ میں چھیلوں گا اپنے جبڑوں کو۔(۶) جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تہجد کے لئے بیدار ہوتے تو اپنے منہ کو مسواک سے رگڑتے۔(۷) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول تھا کہ رات کو دو دو رکعت نفل پڑھتے اور ہر چار رکعت پر مسواک فرماتے۔(۸) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دن و رات جب بھی بیدار ہوتے تو پہلے مسواک کرتے پھر وضو کرتے۔ (۹) اگر میں ہر نماز کے لئے مسواک کرنے کو اپنی امت کے لئے مشکل نہ سمجھتا تو ضرور ان کو اس کا حکم دیتا۔ (۱۰) حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے کیا کرتے تھے؟ فرمایا: مسواک کرتے تھے۔

ان تمام روایات سے مسواک کے حد درجہ اہتمام کی تعلیم و ترغیب معلوم ہوتی ہے حتیٰ کہ رات کے نوافل کے وقفہ میں اور گھر میں دخول پر مسواک کرنا بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے۔

مسواک کا مسنون طریقہ کار:

منھ کی صفائی کا عرف و عادت کے موافق جو بھی طریقہ ہو؛ لیکن احادیث میں جس مسواک کی ترغیبات وارد ہوئی ہیں اس کا مقصود چونکہ منہ میں واقع تغیر کو دفع کرنا ہے، لہذا کڑوے پیڑ سے کاٹی گئی لکڑی سے مسواک کرنا مستحب ہے جیسے اراک و زیتون کی لکڑی، انار اور بانس کی لکڑی استعمال نہ کرے (حلبی کبیر: ۳۳) نیم کی مسواک میں کچھ حرج نہیں بلکہ طبی اعتبار سے مفید بھی ہے اور مسواک کی لکڑی ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے برابر موٹی ہو اور ابتداء میں ایک بالشت رکھنا مستحب ہے اور بعد میں چھوٹی ہو جانے میں کوئی حرج نہیں (شامی: ۱/ ۲۳۴ زکریا) اگر اس کیفیت کی مسواک میسر نہ ہو یا دانتوں کی کمزوری کی وجہ سے استعمال نہ کر سکے تو اب وہ انگلی یا ٹوتھ برش یا کوئی منجن یا گوند منہ میں رکھ کر نفس مسواک کا ثواب حاصل کر سکتا ہے (بحر: ۱/ ۲۱) اور اس بارے میں حضرت علیؓ کا قول التشویص بالمسبحة و الابهام مسواک بھی علامہ حلبی نے نقل کیا ہے (حلبی کبیر: ۳۳) مسواک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ مسواک یا انگلی سے اولاً اوپری دانتوں کے دائیں حصہ کو اور پھر بائیں حصہ کو صاف کرے اور پھر نچلے دانتوں کے دائیں حصہ اور پھر بائیں حصہ کو صاف کرے اور دانتوں کے اندر اور باہر دونوں کو صاف کرے (حلبی کبیر: ۳۳) اور زبان پر بھی مسواک کرے کیوں کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے آپ کے مسواک کرنے کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے کہا و طرف السواک علی لسانه (نسائی: رقم الحدیث: ۲) یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسواک کو زبان پر بھی مل رہے تھے۔

مسواک کے فائدے:

منہ کی بدبو دور ہوتی ہے ،بلغم ختم ہوتا ہے، دانتوں کو مضبوطی ملتی ہے، معدہ کو قوت حاصل ہوتی ہے، منہ سے خوشبو پھیلتی ہے، شیاطین کے وساوس سے حفاظت رہتی ہے، ملائکہ کی فرحت کا سامان ہے۔ (حلبی کبیر: ۳۳)

یہ مسواک کے چند فوائد ہیں جو مسنون ہیئت پر مسواک کرنے سے حاصل ہوں گے اور ان فوائد کے حصول میں اس شکل کی رائج موجودہ زمانہ کی کوئی چیز اس کا بدل نہیں ہوسکتی یہی وجہ ہے کہ ٹوتھ پیسٹ اور برش سے مسواک کا اصل مقصود اور اس کا ایک پہلو یعنی نظافت تو حاصل ہوجاتا ہے (شرح مہذب ۱/ ۲۸۱) انگلی پھیرنے وغیرہ کا بھی یہی حکم ہے لیکن دوسرا پہلو جو آلۂ مسواک کا ہے یعنی وہ چیز جس کے ذریعہ دانتوں کی صفائی کا کام لیا جائے یہ اسی وقت حاصل ہوگا جب کہ مسواک لکڑی کی ہو اور اسی ہیئت کی ہو جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے۔

دورِ حاضر کی کامیابی اس میں ہے کہ ہر سنت فطرت بن جائے

دورِ حاضر کی کامیابی کا واحد تصور صرف اس میں ہے کہ تمام سننِ راشدہ لوگوں میں رائج ہوجائیں اور زمانہ بہ زمانہ لوگ اسے اختیار کرتے رہیں، حدیث شریف میں جن دس چیزوں کو امورِ فطرت میں شمار کیا گیا ہے وہ انبیاء کرام کے چلائے ہوئے ایسے طریقے ہیں جو قرنہا قرن سے لوگوں میں مسلسل چلے آرہے ہیں کیا پتہ کہ شاید اسی ایک سنت مسواک پر عمل سے خدائے دو جہاں ہمیں بامراد کرے۔ اللہ ہم سب کو عمل کی توفیق دے۔ آمین

ادارہ کا ۲۷واں سالانہ جلسہ تکمیلِ حفظِ قرآن مجید

قارئین ماہنامہ اشرف الجرائد کو یہ جان کر بے حد خوشی ہوگی کہ ادارہ اشرف العلوم ٹرسٹ حیدرآباد کے قیام کو ۳۰ سال مکمل ہوچکے ہیں، ادارہ کے ۳۰ سالہ قیام کے دوران الحمدللہ امت کے ۸۰۴ بچے حفظِ قرآن مجید کی سعادت سے مشرف ہوئے، ایسے ہی خوش نصیبوں کی تہنیت کے لئے اس سال سالانہ جلسہ کا انعقاد بتاریخ ۱۶ صفر الخیر ۱۴۳۷ھ مطابق ۲۹ نومبر ۱۵ء بروز اتوار، صبح ۹ بجے تا ۲ بجے ہوگا۔

جس میں انشاء اللہ ۹۵ طلبہ کرام تکمیل حفظ کی سعادت حاصل کریں گے۔ یہ جلسہ حضرت مولانا مفتی محمد عبدالمغنی صاحب مدظلہٗ کی سرپرستی میں منعقد ہوگا۔ بطور مہمانِ خصوصی حضرت مولانا **محمد سلمان** صاحب مظاہری مدظلہ العالی ناظم مظاہر علوم سہارنپور تشریف لائیں گے، حاضرین سے خصوصی خطاب ہوگا، علاوہ ازیں ریاست کے دیگر علماء بھی اس اجلاس میں شریک ہوں گے۔ قارئین ماہنامہ وسرپرستانِ طلبہ سے گذارش ہے کہ اس مبارک ومتبرک اجلاس میں شرکت فرمائیں اور علماء کرام کے قیمتی بیانات سے مستفید ہوں۔ خواتین کے علاحدہ پردہ کا نظم بھی رہے گا۔ ان شاء اللہ

تفصیلات کے لئے رابطہ کیجئے: **9848623931**

فقہ وفتاویٰ

سود کی رقم سے رشوت اور ٹیکس دینے کے بعض مسائل

ادارہ

سوال: دارالافتاء دارالعلوم دیوبند سے ایک فتویٰ جاری ہوا، جس کے مطابق بینک سے ملنے والے سود کو (۱) انکم ٹیکس، (۲) سیل ٹیکس، (۳) ویٹ ٹیکس، (۴) کسٹم ڈیوٹی میں خرچ کرنے کی گنجائش ہے؛ البتہ ہاؤس ٹیکس میں خرچ کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے، اس میں اشکال یہ پیدا ہورہا ہے کہ کس دلیل کی بنیاد پر ۱ تا ۴ میں گنجائش نکالی گئی ہے اور ہاؤس ٹیکس میں ناجائز قرار دیا گیا ہے؟

جواب: بینک کا کاروبار سود پر مشتمل ہوتا ہے؛ جس میں شرکت واعانت ناجائز ہے کما ھو مصرح فی الحدیث رقم جمع کرنے سے بھی اعانت ہوتی ہے وہ بھی اس میں شامل ہے؛ البتہ اپنی رقم کے تحفظ کی کوئی صورت نہ ہو یا حکومت کی جانب سے انسان بینک میں رقم جمع کرنے کا پابند ہو ایسی مجبوری کے وقت ضرورۃً بہ نیت تحفظ رقم بینک میں جمع کرنے کی گنجائش ہے، اس پر ملنے والا سود قطعی حرام ہے، اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں ہے، ایسے حرام مال کا اول حکم تو یہ ہے کہ اصل مالک کو لوٹا دیا جائے، لہذا بینک سے سود کی رقم نکالنا ہی جائز نہ ہونا چاہیئے، لیکن جب یہ تحقیق ہوئی کہ اس طرح کی رقموں کو اسلام کے خلاف چیزوں کی ترویج وتعمیر میں خرچ کیا جاتا ہے، تو علمائے کرام نے مجبوراً اس کے نکال لینے کا حکم کیا اور اس رقم کے دوسرے مصرف یعنی فقراء پر بلا نیتِ ثواب صرف کرنے کا فتویٰ دیا؛ کیوں کہ مال حرام اگر اصل مالک تک واپس نہ کیا جاسکے تو اس کے لئے فقراء میں صدقہ کرنے کا وجوبی حکم ہوتا ہے۔

اس تمہید کے بعد سمجھئے کہ مذکور فی السوال ٹیکس میں ۱ تا ۴ رحکومت کے غیر شرعی ٹیکس ہیں، جن کے بدلے ٹیکس دہندہ کو کوئی ذاتی منفعت یا معاوضہ حاصل نہیں ہوتا؛ لہذا ان ٹیکسوں میں ادا کردینا گویا کہ حکومت کو ہی واپس کردینا ہوا (کیوں کہ بینک حکومت ہی کی ملکیت میں ہوتے ہیں اگر کوئی بینک حکومت کی ملکیت نہیں ہے تو اس سے ملنے والا سود مذکورہ ٹیکسوں میں ادا نہ کیا جاسکے گا)؛ اس لئے ان ٹیکسوں میں ادا کرنا جائز ہوا۔

مذکورہ چار ٹیکسوں کے برخلاف ہاؤس ٹیکس، اس میں کہیں واٹر ٹیکس اور سیور ٹیکس بھی شامل ہوتا ہے، اس کی

وجہ سے انسان گورنمنٹ سے پانی کی تحصیل کرتا ہے، سیوریلائن کی صفائی اور نالی وسڑک کی صفائی کے منافع حاصل کرتا ہے، ٹیکس انہیں کا معاوضہ ہوتا ہے؛ لہذا سود کی رقم دے کر اس کے بدلے میں کوئی منفعت یا معاوضہ حاصل کرنا چونکہ جائز نہیں ہے؛ اس لئے ہاؤس ٹیکس میں سود کی رقم دینا جائز نہیں ہے، اور جن جگہوں میں ہاؤس ٹیکس میں پانی اور سیور کا ٹیکس شامل نہیں ہوتا؛ بلکہ سب ٹیکس الگ الگ وصول کئے جاتے ہیں، وہاں بھی ہاؤس ٹیکس کے بدلے میں آدمی مکان کے سامنے کی نالی اور سڑک کی صفائی کی منفعت حاصل کرتا ہے، جو سود کی رقم ادا کر کے حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔

سود کی رقم رشوت اور ٹیکس میں دینے کا حکم

سوال: (۱) کیا سود کے پیسے سے رشوت بحالت مجبوری دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ (۲) ہندوستانی حکومت جو جبراً انکم ٹیکس وصولی کرتی ہے تو کیا اس کو بذریعہ سود دیا جاسکتا ہے؟

جواب: (۱) سود کی رقم رشوت میں دینا جائز نہیں۔ (۲) ہندوستانی حکومت جبراً انکم ٹیکس جو وصول کرتی ہے، وہ غیر منصفانہ اور ناواجبی ہے، اس بنا پر اس میں سود کی رقم دینے کی گنجائش ہے، البتہ ان ٹیکسوں میں سود کی رقم دینا جائز نہیں جو منصفانہ اور واجبی ہیں اور اس کا نفع خود انسان کی ذات کو پہونچتا ہے؛ مثلاً پانی، روشنی، مکان کا ٹیکس چونکہ ان سب چیزوں کا نفع محسوس طور پر حکومت ہماری طرف لوٹا دیتی ہے؛ اس لئے ان سب چیزوں میں سود کی رقم دینا جائز نہیں۔ (چند اہم عصری مسائل: ۳۲۵۔ ۳۲۸)

ہندوستان میں سود کا حکم

سوال: ہمارے علاقہ میں ایک عالم صاحب ہیں جو دیوبند کے پڑھے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں کہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد ہیں، کہتے ہیں کہ ہندوستان دارالحرب ہے لہذا یاں مسلمان ہندوؤں سے سودی لین دین کرسکتا ہے، یعنی سود لے سکتا ہے، کیا یہ صحیح ہے؟

جواب: حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ ایک مجلس میں موجود تھے، یہ مسئلہ وہاں زیر گفتگو آیا، دیگر اہل علم حضرات اس پر گفتگو فرمارہے تھے حضرت شاہ صاحبؒ سے عرض کیا گیا کہ آپ فرمائیں تو یہ جواب دیا تھا: کہ ''جس کو جہنم میں جانا ہو، راستہ سیدھا ہے، مگر ہماری گردنوں کو پُل بنا کر مت جاؤ'' قرآن کریم میں صاف صاف مذکور ہے'' احل اللہ البیع وحرم الربوا'' حرمتِ ربوٰ سے قبل جو لوگ اہل حرب سے معاملات کرتے تھے ان کو ہی گذشتہ بقیہ سود لینے سے منع فرمادیا گیا: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۲۷۸﴾ (فتاویٰ محمودیہ: ۱۶/ ۳۶۷)

خبرنامہ

عالمِ اسلام کی خبریں

مولانا محمد عبدالقادر فرید قاسمی*

اسرائیلی مظالم پر سعودی عرب کا اظہارِ مذمت:

سعودی کابینہ نے فلسطینیوں کے خلاف قابض اسرائیلی حکومت کے بڑھتے ہوئے حالیہ وحشیانہ مظالم اور مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی کے واقعات کی شدید مذمت کی ہے، کابینہ نے سیکیوریٹی کونسل، متعلقہ بین الاقوامی غیر حکومتی تنظیموں پر زور دیا کہ وہ فلسطینیوں کے خلاف کئے جانے والے جرائم رکوانے میں اپنا کردار ادا کریں، کابینہ نے القطیف کے علاقے سیھات کی الکوثر کالونی میں مسجد کے احاطے میں فائرنگ سے جاں بحق ہونے والوں کے لواحقین سے دلی تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے زخمیوں کی جلد صحت یابی کی دعا کی۔ (روزنامہ اعتماد: ۲۱/اکتوبر ۱۵ء)

سعودی عرب کا ایران سے اظہارِ تعزیت جاں بحق ایرانیوں کی تعداد 464 ہوگئی

سعودی عرب اور ایرانی میڈیا نے کہا کہ کل دونوں ممالک کے وزرائے صحت نے بحر احمر کی بندرگاہ جدہ میں ملاقات کی اور اس اجلاس میں سعودی عرب کے وزیر صحت نے شاہ سلمان کی طرف سے ایران کے لیڈر آیت اللہ خامنہ ای کو تعزیت بھیجی ہے ساتھ ہی انہوں نے حکومتِ ایران اور عوام سے بھی تعزیت اور ہمدردی کا اظہار کیا ہے، ایران کے وزیر صحت حسن غازی زادہ ہاشمی کے حوالے سے سرکاری خبر رساں ایجنسی ایران نے بتایا کہ ایران اور سعودی عرب نے ۲۴/ستمبر کو پیش آئے سانحہ پر لفظی جنگ ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور مہلوکین کی شناخت میں ایک دوسرے کے تعاون سے اتفاق کرلیا ہے۔ (روزنامہ اعتماد: ۲/اکتوبر ۱۵ء)

حوثیوں نے دورِ فاروقی تاریخی جامع مسجد شہید کردی

یمنی محقق اور اسلامی آثار قدیمہ کے ماہر محمد القادری نے "العربیہ ڈاٹ نیٹ" کو بتایا کہ وسطی یمن کے اِب شہر میں جامع مسجد العمری دوسرے خلیفہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کی ایک اہم ترین تاریخی یادگار تھی۔ القادری نے کہا کہ ان کے پاس مسجد کو شہید کرنے میں حوثیوں کے ملوث ہونے کے ناقابل تردید شواہد موجود ہیں۔ مسجد کا مینار اومنذنہ حوثیوں نے مسمار کردیا ہے جس کے باعث مسجد کا ایک بڑا حصہ شہید ہوگیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مسجد کا مینار اس وقت ایک دھماکے سے مسجد پر اگرا جب لوگ وہاں نماز میں مصروف تھے۔ یہ حادثہ کسی قدرتی آفت، بارش یا آسمانی بجلی گرنے کا نتیجہ نہیں اور نہ ہی کوئی فضائی حملہ یہاں کیا گیا ہے۔ یہ صرف حوثیوں کی سازش ہے۔ مسجد کا جو مینار شہید ہوا ہے اس کی مرمت کچھ ہی عرصہ قبل کی گئی تھی، اس لیے اس کے خود بہ خود گرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (العربیہ ڈاٹ نٹ: ۳۱/اکتوبر ۱۵ء)

*استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا